نتھ کا بوجھ

واجدہ تبسم

نتھ کا بوجھ

واجدہ تبسّم

اورسیز بک سینٹر

پلاٹ نمبر ۵۴ - ۱ - نارتھ لنکن روڈ، جوہو ولے پارلے اسکیم
بمبئے نمبر ۵۸
فون ۵۷۸۲۶۳

دائمی جملہ حقوق چاندنی بی کے نام

سلسلہ مطبوعات نمبر ۵

بار اول

جون ۱۹۷۷ء

قیمت ۱۰ روپے

تعداد اشاعت ۱۰۰۰

ناشر:- ٹیپو سلطان۔ اورسیز بک سنٹر ۵۲ جہو ولے پارلا اسکیم بمبئی ۵۸

طابع :- سراج الدولہ

پرنٹر پبلیشر: یونیورسل پرنٹرس ۲۳ نور وجی اسٹریٹ بمبئی ۲

کتابت : شمس

مصنفہ کا پتہ:- ریلوے بلاک ۱۳۱

فلیٹ نمبر ۱ سنتا کروز ویسٹ بمبئی ۵۴

اپنی اکلوتی بیٹی

چاندبی بی کے نام

جسے میں

سنبل کہتی ہوں

فہرست

۱ -	نخق کا بوجھ	۵
۲ -	ہیرا	۲۲
۳ -	سونا چاندی	۴۱
۴ -	ماں	۶۷
۵ -	محبّت	۷۶
۶	جنت کی راہ	۱۰۰
۷ -	ساحل اور طوفان	۱۱۹
۸ -	درخت اور پھل	۱۳۸
۹ -	کنگن	۱۵۷
۱۰ -	دو بیٹیاں	۱۷۷
۱۱ -	چڑھاوا	۱۹۱
۱۲ -	رنگِ حنا	۲۰۳
۱۳ -	آئینہ	۲۲۳
۱۴ -	یارا ئی	۲۳۷
۱۵ -	سورج	۲۶۲
۱۶ -	عیدی	۲۸۷

نتھ کا بوجھ

میں بھی دلہن بنوں گی ——

میں بھی دلہن بنوں گی ——

یہ میرے بچپن کی بات ہے، ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی، اس زمانے میں زندگی کا کوئی واضح تصوّر میرے ذہن میں نہ تھا۔ میں اپنی امّاں کے ساتھ کسی شادی میں گئی تھی۔ زیورات، سرخ کپڑوں اور خوشبوؤں سے لدی پھندی خوبصورت سی دلہن دیکھ کر بس میں نے اکدم طے کر لیا تھا کہ میں بھی دلہن بنوں گی! لیکن تھوڑی ہی دیر میں باہر سے جب نکاح خوانی ہو چکنے کا شور بلند ہوا اور دلہن نئے سرے سے سنواری جانے لگی تو سسرالی عورتوں میں سے ایک، جو سب سے بھاری بھرکم تھی، اپنے ہاتھوں میں تولے، سوا تولے کی وزنی نتھ لے کر اٹھی (اور کچھ یوں

جیسے دلہن کوئی بے جان چیز ہو) اور دلہن کی نازک سی ناک میں ڈال دی، ہائے وہ نازک سا چہرہ، ننھی سی پتلی سی سرخ سرخ ناک اور اس پر نتھ کا بوجھ — میں زندگی بھر وہ سنگ دل لمحہ نہیں بھول سکتی جب نتھ کے بوجھ سے دلہن کے چہرے کا رنگ "پکے" سیب جیسا ہو کر رہ گیا تھا اور ناک یوں سُرخ ہو رہی تھی کہ اب خون ٹپکا کہ تب خون ٹپکا!

اور جبھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں کبھی دلہن نہ بنوں گی، ... میں کبھی شادی نہ کروں گی، یہ نتھ کا بوجھ کتنا بھاری ہوتا ہے! اور یہ سسرالی عورتیں کتنی بے حس اور ظالم ہوتی ہیں — نہیں نہیں میں یہ ظلم نہ سہہ سکوں گی، میں شادی ہی نہ کروں گی، میں کبھی نتھ نہیں پہنوں گی!

لیکن لڑکیاں کتنی معصوم اور بھولی ہوتی ہیں۔ صرف کہہ دینے اور سوچ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ عورت کا جنم لیا ہے تو نتھ تو پہننی ہی پڑے گی یہ بوجھ تو سہنا ہی پڑے گا۔ اور ایسا ہی ہوا جب میں بڑی ہوئی تو گھر میں میری شادی کی بات چیت ہونے لگی — میں کیسے کیسے تڑپی مجھ پر ظلم نہ کرو۔ خدا کے لئے مجھے بابل کے انگنا میں یوں ہی کھیلتے رہنے دو —! لیکن میں عورت تھی نا — ؟؟

باہر نکاح خوانی ہو چکنے کا شور اُٹھا اور میری سسرالی عورتوں میں سے ایک نے اُٹھ کر میرا سر اپا ہوا ریشمی سرخ گھونگٹ ہٹایا اور پھر اسی بے دردی سے جیسے میں انسان ہی نہ تھی — ایک وزنی نتھ میری ناک میں چبھو دی — میری چھوٹی سی ناک اور سوا تولے کی بھاری نتھ — ناک سرخ ہو کر ایک طرف کو جھک سی گئی اور میں سسک سسک کر رونے لگی —

کیا اس سے بھی کڑا کوئی بوجھ ہوتا ہوگا ـــ ؟

ریشمی کپڑوں، پھولوں، اور زیورات کے بوجھ سے میری کمر جھکی جا رہی تھی۔ اب ڈولی دروازے سے لگ چکی تھی اور رخصتی کا وقت آ لگا۔ کسی نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

"چلو بیٹی ـــ اٹھو ـــ اس گھر میں تو تم مہمان تھیں ـــ اب تمہیں اپنے اصلی گھر جانا ہے ـــ۔"

میں نے دھیرے سے قدم اٹھانا چاہا ـــ ارے ـــ یہ پاؤں آگے کیوں نہیں بڑھتے ـــ؟ میرے پیروں میں زنجیر بھی تو نہیں، پھر ـــ؟ کس نے ان قدموں کو آگے بڑھنے سے روک دیا ہے ـــ؟ طاقوں میں رکھی گڑیاں، جنھیں ایک مدت سے کبھی چھوا تک نہ تھا۔ سامنے آکر کھڑی ہوگئیں ـــ "ہم نے روکا ہے تمہیں ـــ کیوں رانی ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہو؟ بھول تو نہیں جاؤ گی ـــ؟"

ساتھ کھیلا ہوا بھیا، جو عمر میں بس دو برس بڑا ہی ہوگا۔ لیکن جس سے کبھی بنی نہیں، جس سے ہمیشہ چھوٹے کا سا برتاؤ کیا۔ لڑائی جھگڑا ہی کیا، صلح کبھی نہیں، جیسے جی ہار کر پلو پکڑ کر آ کھڑا ہوا۔

"تمہیں میری شیشے کی گولیاں چھیننے اور چھپا کر رکھنے کا کتنا چاؤ تھا ـــ میں اب کھیلنا بھی چاہوں تو پیارے کون اُلاہنے دے ـــ؟ کون چھینے، کون چھپائے ـــ؟ وہ دیکھو کونے میں کتنی ساری گولیاں پڑی ہیں ـ کون کھیلے مگر ـــ؟ اور ان آنکھوں میں بھی جھانک کر دیکھو ـــ کتنے سارے آنسو جھلملا اُٹھے ہیں کیا ان سب کو بھلا دو گی بلو ـــ؟"

چاندی کی مدھر گھنٹیوں کی طرح بجتی ہوئی ہنستی ہوئی سہیلیاں، جن کے ساتھ زندگی کا ہر پیار بھرا، سکھ بھرا لمحہ بیتا تھا بے آواز صدا سے پوچھنے لگیں۔

"پیا کے دیس جا کر بھول تو نہ جاؤگی؟ سُنا ہے جس دیس کی اور تم قدم بڑھا رہی ہو وہ بڑا رنگین دیس ہے۔ اس کی رنگینوں میں ڈوب کر کبھی ان دلوں کا خیال بھی کروگی، جنھوں نے تمہارے ساتھ بیتنے ہر لمحے کو زندگی کی معراج سمجھا تھا؟"

یہ کیسی آوازیں ہیں ۔۔؟ یہ کون سی طاقت ہے جو میرے بڑھتے قدموں کو روک رہی ہے۔ مجھے جانا ہے ۔۔ مجھے تو اس دیس کو جانا ہی ہے۔ جہاں کی ہر گلی نادیدہ، ہر رہگذر اجنبی اور ہر راستہ میرے لئے نیا ہے۔ لیکن مجھے جانا ہے ۔۔ مجھے نہ روکو ۔ خدا کے لئے۔

میں نے بڑی ہمت سے پاؤں بڑھایا ۔ یہ میرے میکے کی دہلیز کی خاک! یہ دہلیز جہاں میں نے اپنی معصوم زندگی کے سترہ برس بتائے ۔۔ یہیں رہ کر میں نے گھٹنوں گھٹنوں چلنا سیکھا ۔۔ اسی جگہ میرے دل نے پہلی بار محبت کا نام سُنا ۔ اب یہ دہلیز میرے لئے پرائی ہو جائے گی کون جانے وقت کا بوڑھا اور بے رحم ہاتھ مجھے کن اندھیری وادیوں میں لے جا کر پھینک دے، کون جانے میں پھر اس دہلیز پہ قدم رکھوں بھی یا نہیں ۔ آ اے مقدس خاک ۔ میں تجھے اپنی مانگ میں بھر لوں، تو مجھے افشاں سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔

"میری منّی بہن ۔۔ میری طرف یوں معصوم آنکھیں اُٹھا کر نہ دیکھ کہ میں نے ہمت کر کے جو قدم اُٹھایا ہے وہ پھر پیچھے پلٹ آئے ۔ جانے والوں کی راہوں میں آنسوؤں کے ستارے نہیں بکھیرا کرتے ۔ میری جان مسکراہٹ

کے چند پھول پھینک دے، تاکہ میری راہیں مہک جائیں اور میں دھیرے دھیرے اس راہ پہ بڑھتی جاؤں جس کے تصور سے ہی میرا دل کانپ رہا ہے۔

بھابی میری سکھی — میں نے تم سے زندگی میں کبھی کچھ نہیں مانگا — آج جو مانگوں دیدو — بس اپنا یہ آنسوؤں بھرا چہرہ اُدھر پھیر لو — میری یاد میں روؤ مت بھابی — میرے بھیّا کو تم نے پرکھا نہیں؟ انھیں تم سے کتنا پیار ہے۔؟ وہ کبھی تمہاری بات نہ ٹالیں گے۔ جب تمہیں میری یاد بے کل کر دے۔، ایک سانولی سہانی شام کو بھیّا کو میری سسرال بھیج دینا بھابی — تم نہیں جانتیں بھابی بہنوں کو اپنے بھائیوں پر کتنا مان ہوتا ہے کتنا ناز —!! میرے خوبرو بھائی کو دیکھ کر سسرال کے سارے لوگ دیکھتے رہ جائیں گے۔ کوئی مجھے روک نہ سکے گا۔ میں تمہارے ساتھ جھولنے، سیر کرنے، ساون کے گیت گانے ضرور آؤں گی بھابی، لیکن اس وقت منزل کھوٹی نہ کرو — مجھ سے یہ تمہارے آنسو نہیں دیکھے جاتے بھابی!

نہیں اماں نہیں — خدا کے لئے آپ سامنے نہ آیئے، دیکھئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں — مجھ سے آپ کا یہ حال دیکھا نہیں جاتا — میری آنکھوں کے سامنے میری پچھلی زندگی کا ہر ہر لمحہ پلٹ آیا ہے — یہ آپ ہی تو ہیں جو راتوں کو جاگ رہی ہیں۔ میں بیمار ہوں تو مجھے بہلا رہی ہیں۔ میں نے مٹی میں کھیل کر اپنے کپڑے گندے کر لئے ہیں۔ تو آپ نہلا کر مجھے گڑیا کی طرح سنوار رہی ہیں — آپ مجھے الف۔ ب، پ پڑھنا سکھا رہی ہیں کہ میں زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہ جاؤں۔ یہ میرے ننھے ہاتھوں کی ٹیڑھی میڑھی روٹیاں ہیں۔ جنھیں آپ فخر سے ایک ایک کو دکھا رہی ہیں

کہ میری بلّو نے پہلی بار پکائی ہیں۔ یہ میری گڑیاں، جن کی شادی بیاہ میں آپ دلچسپی لے رہی ہیں — اور اب یہ میرے جوانی کی طرف بڑھتے قدم — اور آپ کا فکروں سے بھرا چہرہ کہ بس جیسے بنے جوان لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے — میری بند آنکھوں کے سامنے ہر ہر واقعہ اُبھر آیا ہے امّاں۔ اب ہزار منتوں کے بعد وہ لمحہ آیا ہے کہ آپ کے سر کا بوجھ اُترے۔ اب اس لمحہ آپ میرے قدم نہ ڈگمگایئے امّاں۔ میرے کندھے نازک ہیں اور بوجھ بے حد بھاری —"!!

کتنے سارے تیر اور ایک نازک سا دل — جانے کس طرح میں ڈولی تک پہنچوں گی، — بوجھل قدموں سے میں نے ڈولی میں قدم رکھا — سازوں کی آواز اونچی ہونے لگی، میراثنوں نے وداعی گیت چھیڑ دیا۔ اور ڈولی آگے بڑھنے لگی، — دھیرے دھیرے — کہاروں نے ڈانڈے تھامے — ایک قدم — دوسرا قدم — میں نے پردہ ہٹا کر جھانکا — اب یہ ساری گلیاں پرائی ہو جائیں گی، میں نے بڑے کرب سے سر اٹھا کر دیکھا — ارے یہ اندھیرے میں کون کھڑا ہے — آستینوں سے بار بار یہ کون آنکھیں پونچھے جا رہا ہے — ؟ ارے یہ تو ابّا ہیں —!! ابّا آپ نے تو ہمیشہ یہی کہا تھا کہ میں بلّو کے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ میں اپنی بیٹی نہیں بیاہوں گا — امّاں ہنس کر، کچھ ملول ہو کر کہتی تھیں — بڑے بڑے پیغمبروں نے اپنی بیٹیاں، نہیں بٹھائیں تو ہم کون قطار شمار میں ہیں —"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیتے — "نا بھئی اپنا اتنا بڑا دل نہیں —"
ابّا — میرے ابّا — اب میں آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ سے

دور ہو رہی ہوں اور آپ بڑھ کر مجھے گلے بھی نہیں لگاتے ۔ اب صبح کے پر نور اُجالے کے ساتھ کون میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جگایا کرے گا۔ "اٹھو بیٹی نماز کا وقت ہو گیا ۔ ساری چڑیاں جاگ گیئں ۔"

ابّا اب آپ ہوں گے نہ وہ آنگن ۔ نہ وہ چڑیاں ، جن پر ہر بیٹی کو ناز ہوتا ہے ، غرور ہوتا ہے کہ میرے میکے کی باسی ہیں ۔ اب میں ہوں گی ۔ زندگی کی طول طویل اکیلی راہیں ہوں گی ، اور یہ کڑا بوجھ ۔ اکدم کہاروں نے ایک دیہاتی وداعی گیت چھیڑ دیا ۔ اور قدم بہ قدم تیز تیز چلنے لگے ۔ میکے کی گلیاں در و دیوار ، بھائی بہنیں ، سکھی سہیلیاں سب دور ہونے لگیں ۔ اور میری اماں بھی جن کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ہی نہ تھا ۔ اور بوڑھے ابّا بھی جن کے بڑھاپے کو میری ضرورت تھی ۔ دور سے کپکپاتی ، درد میں ڈوبی آنسوؤں سے بوجھل آواز آئی

"کہارو ! ذرا آہستہ ۔ ذرا آہستہ ۔ میں نے بڑے نازوں سے اپنی بیٹی کو پالا ہے ۔ اسے دھکّا نہ لگنے دینا !"

آنسوؤں کی تیز بوچھار کے ساتھ میری نتھ کا بوجھ دگنا ہو گیا ۔ ابتک میں سوچ رہی تھی کہ کیا نتھ کے بوجھ سے بھی بڑا کوئی بوجھ ہوتا ہو گا ۔ اب سمجھ میں آئی کہ جدائی کا بوجھ تو اس سے بڑا ہوتا ہے ۔ ! ! کہیں بھاری !

میں اپنا گھر بار ، بھائی بہن ، ماں باپ ، سب چھوڑ کر سسرال آگئی ۔ میں نے تو یہ دیکھا تھا کہ نئی نئی دلہنیں ، محبت کرنے والے دُلہوں کو پاکر ، اپنا ماضی اپنا سب کچھ بھول جاتی ہیں ۔ اور جب سسرال سے میکے لوٹتی ہیں تو نئی زندگی کی خوشیاں اُن کے چہروں پر پونم کا چاند بن کر جگمگاتی ہیں ۔ روپ دونا ،

نکھر آتا ہے۔ پر جانے کس مٹی سے میری تعمیر ہوئی تھی کہ میں اپنا ماضی نہ بھلا سکی ۔ پہلے تو سب نے نئے نئے پن پر محمول کیا کہ آگے چل کر سب بھول جائے گی ۔ لیکن جس طرح سورج جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس میں گرمی اور تیزی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح میری یادوں کے سورج کی گرمی بڑھتی گئی ۔ تیزی بڑھتی گئی ۔

شادی کو چند ماہ گزرے تھے کہ خدا نے مجھے زندگی کو نئے طور سے پرکھنے کا موقع دیا۔ مجھے تصور میں ان رنگین اور سہانی کلکاریوں کی گونج سنائی دے گئی جو سونے سے سونے آنگن کو بھی زندگی سے بھرپور کر دیتی ہے۔ شائد یہی ایک لمحہ تھا کہ میں سنبھل سکتی تھی - اپنی یادوں اور ماضی کو خوشیوں سے تولتی تو خوشیاں جیت جاتیں کہ ایک دن میں جلدی جلدی کسی کام سے سیڑھیاں اُتر رہی تھی کہ پاؤں پھسلا اور میرے گرتے ہی میری خوشیوں کی جنت بھی سنسان ہو گئی ــــ میں اپنا وہ کرب، وہ دُکھ کبھی الفاظ میں بیان نہ کر پاؤں گی۔ اور میں جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ زندگی میں نتھ کا بوجھ ہی سب سے بھاری ہوتا ہے، یہ سمجھنے پہ مجبور ہوئی کہ اس بوجھ سے بھاری بھی کئی بوجھ ہیں۔ میرے دل نے مجھ سے پھر وہی پرانا سوال دہرایا۔

جب زندگی میں اتنے دکھ بھرے پڑے ہیں تو عورت آخر یہ نتھ کا بوجھ اُٹھاتی کیوں ہے ــ ؟ حسب معمول میرے دل کو کوئی جواب نہ سُوجھا ــ

وہ دُکھ جس نے میرے دل پر، میری زندگی پر خوشیوں کے دروازے بند کر دیئے۔ ایسا نہ تھا کہ اتنی آسانی سے بھول جاتی، لیکن کسی کی ہمدردی کے بجائے یہ بول سننے کو ملے ــ "بہو منحوس ہے ــ!"

"دلہن کا پاؤں اِس گھر کو مبارک نہیں لگا۔"

میرا دل کٹ کر رہ جاتا۔ جی چاہتا جاؤں اماں اور ابا کے گلے لگ کر جی بھر کر آنسو بہاؤں — انہی دنوں گھر سے بھابی کا خط آیا کہ ابا کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں — میں بے حد تڑپی، لیکن جا نہ پائی۔ گرمیوں کی سنسناتی دوپہر میں جب سب سو جاتے، میں برآمدے کے پچھلے چبوترے پر بیٹھی ان ننھی ننھی چڑیوں کو حیرت سے تکا کرتی جن پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جن کا جہاں جی چاہتا اڑ کر چلی جاتیں۔ جو آزاد تھیں اور خود مختار۔ لیکن میں چڑیا نہ تھی انسان تھی جس کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اتنے بڑے گھر میں جو سب سے میرے قریب تھے۔ حالات کے ہاتھوں وہی سب سے دور ہو گئے ان کی سروس شہر میں لگی ہوئی تھی۔ مکان کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھے سسرال ہی میں چھوڑ گئے تھے۔ اور یوں میں بالکل بے دست و پا تھی

بہت سارے اُداس دن یونہی گزرے اور وقت نے ایک بار مجھے پھر قائل کر دیا۔ جس بوجھ کو تم دلہن بنتے وقت بہت بھاری سمجھتی تھیں۔ دنیا میں اس سے بھی کہیں بھاری بوجھ ہیں — اور خاص طور سے موت کا بوجھ — جو تم سے اپنی جان سے زیادہ چاہنے والا باپ چھین لے جاتا ہے۔ اور تم کچھ کر بھی نہیں سکتیں — جب میں بہت چھوٹی سی تھی اور ابا بہت بڑے تھے وہ اماں سے ہنس کر کہا کرتے تھے۔ "جب میں اور زیادہ بوڑھا ہو جاؤں گا اور میری بلّو اور زیادہ بڑی ہو جائے گی۔ اور میں پلنگ پر پڑا پڑا کھانسا کروں گا، کام کرنے سے معذور ہو جاؤں گا۔ تب میری بلّو بڑھاپے کی لاٹھی بن جائے گی۔ وہ دوڑ دوڑ کر میرا ہر کام کیا کرے گی۔ میری ہر ضرورت کا

سامان لا لا کر دیا کرے گی۔ چائے پلائے گی پان کوٹ کوٹ کر کھلائے گی اور میں بیٹھا سوچا کروں گا اولاد دے کر خدا کتنا بڑا سکھ دیتا ہے۔ کہ لنگڑا ہو جانے پر بھی انسان پاؤں رکھتا ہے۔ لولا ہو جانے پر بھی ہاتھ رکھتا ہے اور بینائی کھو چکنے پر بھی سارے میں جگمگاہٹ بھری رہتی ہے۔"

اس جگمگاہٹ کی آس لئے ابّا موت کی اندھیری راہوں میں کھو کر رہ گئے جو انھوں نے مجھ سے منسوب کر رکھی تھی۔ گھر میں دوسری بہن بھی تھی، بھابی بھی، چھوٹا بیٹا بھی، بڑا بیٹا بھی، لیکن میں بڑی بیٹی تھی ناجس سے ماں باپ ہر انہونی آس باندھ لیتے ہیں — یہ دکھ! یہ بوجھ!!

دن گزرتے ہیں تو غموں کا احساس بھی مدھم پڑنے لگتا ہے۔ ورنہ انسان کا دل پھٹ کر نہ رہ جائے! لیکن میں کس خاک سے بنی تھی کہ جو غم مِلا وہی مقدّر بن گیا۔ میں اپنے آپ پر جھلّا جھلّا جاتی اور سوچتی کہ میں اوروں کی طرح کیوں نہیں ہوں؟ میں غموں کا تعویذ بنا کر کیوں گلے سے لگا لیتی ہوں — میرے سوال کا میرے دل کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ شائد یہ بات ہو کہ انتہائی بچپن میں شادی اور دلہن بننے کا جو تکلیف دہ تصوّر ذہن میں بیٹھا تھا، وہ سب پر چھا کر رہ گیا۔ اور نتھ کے اس بوجھ نے جس نے دلہن کا چہرہ تکلیف سے بگاڑ دیا تھا، میری زندگی سے ہر خوشی کو دور کر دیا — کون جانے —

زندگی ایک بار مجھ پر پھر مہربان ہوئی۔ فرشتوں نے پھر مجھے مژدہ سنایا کہ "تمہارے قدموں تلے پھر سے جنت تعمیر ہوتی ہے — ذرا سنبھل کے رہنا۔" میں دودھ کی جلی چھاچھ بھی پھونک کر پینے لگی۔ میں اس احتیاط سے

قدم اٹھاتی جیسے شیشے کے محل میں چل پھر رہی ہوں۔ ماں بننے کی اولین خوشی سے میں اسی وسوسے کے مارے محروم رہ گئی کہ کہیں پھر ڈگمگا نہ جاؤں، پھسل نہ جاؤں۔ لیکن خدا مجھ پر مہربان تھا کہ میں نے نو ماہ کا یہ طویل سفر بہت آسانی سے طے کرلیا لیکن ایک بار پھر مجھے پتہ چلا کہ ننھ کے بوجھ سے بھاری بھی کوئی بوجھ ہوتا ہے اور جب میں ماں بننے چلی تو ساری دنیا کے درد ایک ساتھ مجھ میں سما گئے — اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ اس درد سے بڑا درد کوئی نہیں — اس بوجھ سے بھاری کوئی بوجھ نہیں — ماں بننے کا بوجھ !

میں ایک ننھی منّی گڑیا کی ماں بن گئی، جو میری ہی طرح نہ چاہنے پر بھی کسی اجنبی دیس کو بیاہی جائے گی، جس کے پیروں میں بھی پابندیوں کی زنجیریں ہوں گی، جو رہ رہ کر اپنے میکے، اپنے بابل، اپنی سکھی سہیلیوں اور کنبہ قبیلے کو یاد کرے گی، لیکن جا نہ پائے گی — لیکن میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں؟ خدا نہ کرے جو کوئی بھی لڑکی میری طرح اداسیوں کو اپنا مقدّر بنالے! یہ غلط ہے۔ مجھے ایسا نہ سوچنا چاہیئے۔ مجھے ایسا نہ سوچنا چاہیئے — مجھے خوش رہنا چاہیئے — میں خوش رہونگی —

میں اور وہ تو بہت ہی خوش تھے۔ ہماری محبّت کی تکمیل کا ہماری گڑیا زندہ ثبوت تھی۔ لیکن ساس نندوں سسرالیوں کو بیٹے کی آرزو تھی — یوں دنیا دکھاوے کو خوش تو ہوئے لیکن ان کے چہروں سے پڑھا جا سکتا تھا کہ "دلہن کا پاؤں" دلہن کا شگون اچھا نہیں لگا — وہ تو بیٹی کو اس دنیا میں لائی ہے جو بہر حال ایک نہ ایک دن پرائی ہو جائے گی۔

لیکن میں تن من دھن سے اپنی ننھی کو پالنے اور پروان چڑھانے لگی

اس دکھ کو یاد کئے بغیر کہ زندگی میرے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو میری امّاں کے ساتھ اس نے کیا تھا۔

اب انھیں ترقی مل گئی تھی اور حکومت کی طرف سے ایک بڑا سا گھر بھی ماں باپ اور گھر والوں کی نگاہوں کے طنز کو نظر انداز کر کے، وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ زندگی میں پہلی بار طمانیت کا احساس ہوا۔ لیکن وہی کمبخت دل اور وہی سوچیں۔ جب وہ آفس چلے جاتے اور میں سب کاموں کو نمٹا کر ننھی کو سلا دیتی تب ماضی کی ہر ہر یاد ناگ بن کر ڈستی اور میں سوچتی آخر ہر عورت کیوں نتھ کا بوجھ اُٹھاتی ہے۔؟

زندگی میں یہ آسرا کتنا غنیمت اور مطمئن کرنے والا تھا کہ انھوں نے مجھ پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کی، مجھے جب میکے کی یاد ستاتی بہت خوشی سے میکے پہنچا دیتے اور لے آتے۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی خود بخود پوری کر دیتے — میں کئی بار میکہ گئی بھی، لیکن کھوئے کھوئے پن کا احساس جی کو چمٹا رہا۔ گزرتے ہوئے سالوں نے میرے آنگن کو اور ہرا بھرا کر دیا۔ اب میں تین بچیوں کی ماں تھی۔ دسوسے کہیں زیادہ اور مستقبل کی فکر اس سے سوا — اور جانے کتنی بار دل نے وہ سوال مجھ سے پوچھا اور میں خاموش رہی اور پتہ نہیں کتنی بار میں نے دل ہی دل میں وہی سوال دہرایا اور وہی مجبور دل کی لاجوابی —!

ایک بار پھر بہار میری بگیا میں جھومی اور میں اب کی بار ایک ننھے مُنّے گول مٹول سے بیٹے کی ماں بنی — اس بار میرا دل ایک انجانے اور بے پناہ

خوف سے دھڑک اٹھا۔ کتنی مائیں ہیں جو کتنے بیٹوں کو جنم دیتی ہیں۔ لیکن جوانی سے بڑھاپے کا سفر طے کرتے ہوئے کیا وہ یہ بھی سوچتی ہیں کہ انھیں اس لاٹھی سے بڑھاپے میں کوئی سہارا ملے گا بھی یا نہیں ـــ؟ میں نے کتنے ہی گھرانے دیکھے تھے جہاں ماؤں نے اپنے جگر کا خون پلا پلا کر بیٹیوں کو پالا۔ سکھ بھرا ہر لمحہ خود پر حرام کر لیا۔ لیکن بیٹوں نے اپنی نئی نویلی دلہنوں کا منہ دیکھا اور ماؤں کو بھول گئے۔ جیسے راہ میں پڑے پتھر کو لوگ بے پروائی سے پاؤں سے ہٹا جاتے ہیں اور ان خیالات کے آتے ہی میں نے پہلی بار اپنے آپ کو جی بھر کر مطعون کیا ۔۔ "کیا تم نے زندگی میں کبھی سکھ سے رہنا سیکھا ہی نہیں۔ کیا تم سوچ بھی سکو گی کہ دنیا میں اگر جنت کا تصور بھی کہیں ہے تو یہی تمہارا گھر ہو سکتا ہے۔ جہاں بے حد چاہنے والا ایک شوہر ہے۔ گڑیوں کی طرح پیاری بچیاں ہیں۔ اور ایک ننھا سا گڈا بھی! جو تمہارے گھر کا چراغ ہے۔ تمہارے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ تمہاری امیدوں کا مرکز، تمہاری خوشیوں کا امین ـــ!" لیکن میں مجبور تھی؟

پھر بھی ڈرے سہمے، میں جی جان سے اپنے ننھے گڈے کی دیکھ ریکھ کرنے لگی، اور وہ ارمان بھرے دن اور رات ـــ جب اس نے ننھے سے منہ سے پہلی بار 'ماں' کہا ـــ جب وہ پہلی بار کھلونا ٹوٹ جانے پر رو پڑا۔ جب پہلی بار ننھا سا پاؤں اٹھا کر چلنے کی کوشش کی ـــ جب پہلی بار اپنے ننھے سے ہاتھ سے روٹی منہ میں ڈالی اور یہ سارے لمحات میرے دل میں مقید ہو کر رہ گئے ـــ اور زندگی میں سب سے گراں تو وہ لمحات گزرے جب میں نے اپنا دودھ چھڑا کر اسے اوپر کے دودھ سے لگایا میں اپنا دودھ پلاتی تھی

تو میرے دل کو یہ غرور، یہ اپنائیت اور یہ عظمت محسوس ہوتی تھی کہ یہ میں ہی تو ہوں جو خدا کے بعد، اس کی زندگی کی ذمّہ دار ہوں ۔ میں کسی کام سے لگی رہتی اور دودھ پلانے میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ ننھے ننھے گھٹنوں کے بل، میرے پیچھے پیچھے رینگتا رہتا ۔ اور میرے دل کو یہ احساس زندگی بخشتا رہتا کہ میں ایک زندگی کے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہوں ۔ میں کتنی عظیم ہوں ۔ لیکن دودھ چھڑا دینے کے بعد میرا بیٹا مجھ سے بیگانہ بیگانہ سا ہو گیا ــــ اب اسے بھوک لگتی تو وہ اپنی بہنوں میں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ کھا لیتا ۔ اور پھر کھیل میں لگ جاتا ــ ہاں البتہ رات میری مامتا کو ہزار غرور بخشتی آتی جب وہ میرے بنا سوتا ہی نہ تھا اور میں رہ رہ کر سوچتی، میرے خدا کوئی نہ کوئی بات، کوئی نہ کوئی سلسلہ یوں باقی رکھنا کہ میرا اور اس کا تعلق ٹوٹنے نہ پائے ۔ لڑکیوں کا کیا ہے، چار دن رہیں گی، پھر اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں گی ــــ بیٹیوں سے بھلا کس نے دل لگایا ہے ــــ؟ میری آرزوؤں کا مرکز تو یہی چراغ ہے ۔ اسے سدا جلتا رکھیو ۔ اس کی جوت کبھی ماند نہ پڑنے پائے ۔

ظالم وقت ــــ بے رحم وقت کس طرح گزرتا ہے کسی کے دل کا، وسوسوں کا اندیشوں کا خیال کئے بغیر بس چلتا چلا جاتا ہے ۔ دیکھنے میں محسوس بھی نہیں ہوتا روز وہی صبح نمودار ہوتی ہے ۔ وہی اجالے، وہی سورج رات اپنے آنچل میں وہی ستاروں کے جھرمٹ لئے آتی ہے ۔ چاند اسی طرح جگمگاتا آسمان پر طلوع ہوتا ہے ۔ سب کچھ وہی ہوتا ہے لیکن کتنے غیر محسوس طور پر، یوں کہ ننھی ننھی کومل کلیاں ۔ جوانی کا روپ دھار لیتی ہیں ــــ اور جوان دم بڑھاپے کی طرف

یوں مائل ہوجاتے ہیں کہ آنکھوں کی چمکیلی بجلیاں مدھم مدھم پڑ جاتی ہیں۔ اور وقت، وہی ظالم وقت جس نے خوابوں کے سبزہ زار پر دھیرے دھیرے قدم رکھ کر کبھی حسین لمحوں کو بشارت دی تھی اب ہولے ہولے قدم ٹکیا دستک دیتا ہے — "میں آگیا ہوں — میں آگیا ہوں!"

اور وقت جو روپ بدل کر ایک بوڑھے کے بھیس میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ پھر ایک بار میرے سکون کو ڈگمگا گیا — ارے — ہم اتنی جلدی بوڑھے ہو گئے۔؟ میں نے لرز کر ان کی طرف دیکھا — وہ اپنے سفید بالوں والا سر لئے ایک آرام کرسی پر نڈھال بیٹھے تھے۔ تین تین بیٹیوں کی وداع کا غم ایک باپ کی کمر توڑ دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ پھر بیٹیاں بھی کیسی، جو مینا‌ؤں کی طرح ہر دم چہکتی، میٹھے بول بولتی ہی رہتی تھیں — میں نے ان کی طرف بھرے دل سے دیکھا اور بوجھل آواز میں بولی۔

"کوئی آپ ہی کی بیٹیاں آپ سے جدا ہوئی ہیں جو دنیا سے منہ موڑ لیا ہے آپ نے — پھر یہ بھی تو سوچئے کہ ہمارا بیٹا جو ہے ہماری دلبستگی کے لئے — یہ تو دنیا کی ریت ہے بیٹیوں کی کمی ہمیشہ بہوؤں نے پوری کی ہے۔" یہ سن کر یکدم اُن کا منہ جگمگا اٹھا۔

اور پھر ہم نے اپنے دل کے سارے ارمان نکال ڈالے — زندگی کا وہ سہارا، جو خدا کے بعد سب سے بڑا سہارا تھا، اس پر ہم نے اپنی زندگی کی ساری پونجی لُٹا دی، — اب گھر میں ایک ننھی منّی خوبصورت سی چھم چھم کرتی دلہن تھی — "تین تین بیٹیاں بیاہ دینے کا وہ بھاری بوجھ کیا بہو کے آجانے

سے ہلکا پڑ جائے گا۔" میں نے ڈوبتے سروں میں اپنے دل سے پوچھا پتہ نہیں ہمیشہ کی ساتھی اداسی نے مجھ پہ یہ بات واضح کی یا حقیقت تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ دلھن کو یہ گھر پسند نہیں ۔ نہ گھر نہ گھر والے بوڑھے ہاں شوہر کی بات اور تھی، وہ سراسر اس کا اپنا تھا۔ جب دونوں ایک ساتھ رہتے تو بیحد گھل مل کر باتیں کرتے، ہنسی اور پیار کی مدھم مدھم شرمیلی آوازیں کانوں میں گونجتی رہتیں ۔ لیکن بیٹے کے آفس جاتے ہی گھر پر سناٹا چھا جاتا دلہن رانی کمرے میں پڑی کتابیں پڑھا کرتی ۔ یا پھر سیون اور نٹنگ لے کر بیٹھ جاتی ۔ اس کے ہاں ننھا سا مہمان جو آنے والا تھا۔

اور ایک دن میرے دل نے وہ غم سہا جس نے میری کمر جھکا کر رکھ دی ۔ ماما دو دن سے بیمار ہو کر چھٹی پر تھی ۔ میری طبیعت بھی اچھی نہ تھی۔ بیٹے نے آفس سے آکر چائے کا مطالبہ کیا تو دلہن رانی گرج کر بولی ۔

"اب کیا مجھے ماماؤں کی طرح کام کرنا پڑے گا. جبکہ گھر میں سب لوگ آرام کرتے رہیں ۔"

سب لوگ ۔ ؟ میرے ذہن پر بجلی سی کڑکی ۔ میں اور وہ ۔ دو بوڑھے دم ۔ اگر ہم نے نے آرام کیا بھی تو کیا یہ زیادتی تھی ؟ کیا زندگی بھر ہم نے بیلوں کی طرح کام نہیں کیا ہے ۔ ؟ کیا اس بڑھاپے میں اب ہم اتنے آرام کے بھی حقدار نہیں ۔ کہ نوکر بیمار ہے تو بہو چائے ہی بنا کر پلا دے ۔ ؟ نہیں یہ ناممکن ہے ۔ یہ زندگی کا بوجھ ہے جو نفقے کے بوجھ سے بھی بھاری ہے ۔ بہر صورت ، بہر حال ۔ اسے اٹھانا ہی ہے ۔ اُٹھانا ہی پڑے گا ۔ ٹھہرو بیٹے ! میں تمہاری بوڑھی ماں تمہارے لئے

چائے لاتی ہوں ۔ میں نے تمہیں جنم دیا ہے۔ میں نے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے تو کسی اور کے بل بوتے پر نہیں ۔ میں تمہاری ماں ہوں نا ۔ تمہاری خوشیوں کی نگہبان ۔ تمہاری چھوٹی بڑی ہر ہر ضرورت کا خیال رکھنے والی ۔ !

اور میں اپنے بڑھاپے کا بوجھ اُٹھائے، باورچی خانے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اکدم مجھے زور سے چکر آگیا، اور میں تیورا کر زمین پر گر پڑی ۔ میرے گرتے ہی تیزی سے کمرے کا دروازہ کھلا ۔ اور بجلی کی سی پھرتی سے میرا بیٹا لپکا ۔ "اماں ۔ ارے اماں آپ گر گئیں ۔ میری ماں" ۔ اور اس نے اکدم مجھے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا جیسے میں کوئی پھول تھی۔

زندگی بھر سے جس سوال نے پریشان کر کے میری خوشیاں چھین لی تھیں مجھے آج اس کا جواب اپنے آپ مل گیا کیا ہر عورت نتھ کا بوجھ اسی لئے نہیں اٹھاتی کہ بڑھاپے میں اسے اولاد کا سہارا مل جائے ۔ وہ سہارا جو دنیا میں خدا کے بعد سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے ۔ ماں باپ کے بڑھاپے کا بوجھ اُٹھانے کے لئے ایسے ہی مضبوط اور محبت بھرے ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے نا کیا یہ لمحہ ایسا نہیں جس پر زندگی بھر کے سارے غم وار دیئے جائیں ۔ کیا کوئی عورت نتھ کا بوجھ اٹھا کر گھاٹے میں رہتی ہے ؟ رہ سکتی ہے ؟ نہیں کبھی نہیں !

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا ۔ میرے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر بے تابی سے بولا ۔ " میری اماں ۔ اچھی اماں ۔ آپ اچھی تو ہیں نا ۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی ۔ ؟ "

میں نے اپنے کمزور ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا اور میری جنم جنم کی پیاسی روح سیراب ہو گئی ۔ !!

ھیرا

"اللہ شادی کو اتنے کم دن رہ گئے ہیں ۔ اتنی ڈھیر ساری سلائی آخر کیسے ہو پائے گی ۔ ؟"

امی کے ہاتھ گوٹے کناری میں الجھے ہوئے تھے۔ سامنے سرخ نیلے پیلے ہرے گلابی کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ـــ وہ اپنے آپ ہی کو سنائے جا رہی تھیں "لڑکی کے جہیز کی سلائی کوئی معمولی بات تو ہوتی نہیں ۔ ارے سالوں گزر جاتے ہیں سالوں ـــ اور یہاں تو ابھی ڈھنگ کے دس جوڑے بھی پورے نہیں ہوئے کسی ساڑھی پر کرن ٹنکنی باقی ہے تو کسی دوپٹے میں ستارے جڑنے رہ گئے ہیں غراروں کا تو آج کل چلن ہی اڑ گیا ہے ۔ ورنہ پہلے زمانے کی دلہنیں کیا خوبصورت لگتی تھیں ـــ چلتی تھیں تو لگتا تھا سارے زمانہ کی بہاریں اپنے ساتھ لئے چل رہی ہیں ۔ اب تو وہی ساڑیاں رہ گئی ہیں ـــ ہمارا کیا ہے ـــ پہنو بی بی ساڑیاں ہی پہنو ـــ لیکن دلہنا پے تک کچھ تو چمک دمک والا کپڑا ہو ۔ یہ نہیں

کہ چار دن کی بیاہی سب ہیں مل کر بیٹھے تو پتہ تک نہ چلے کہ نئی بیاہی کون ہے ؟"

دوسرے کمرے سے شہلا بھاگتی ہوئی آئی اور دھم سے امی کے پاس لوٹ گئی ۔

"اے ہے امی۔ بجیا کی شادی میں پہننے کے لئے میرے لئے بھی کچھ سی دیجیئے نا ۔" ڈھیر سارے رنگین کپڑوں کو دیکھ کر وہ مچلنے لگی ۔

"اے لڑکی چل دور ہٹ ۔ سارے کپڑے مسلے دے رہی ہے پہلے دولہن کا تو ہولے ۔ گھر والوں کا کیا ہے ہوتا رہے گا ۔"

"کیوں امی۔ بجیا کو کتنے جوڑے دے رہی ہیں ۔۔" وہ بڑی لگن سے رنگین شوخ کپڑوں کو دیکھنے لگی ۔

امی سنجیدہ ہو گئیں ۔ " ارے ہم کہاں کے امیر دولت مند ہیں بٹیا ۔ پچیس جوڑے ہو جائیں وہی غنیمت ہے ۔ اصل سوال تو زیور کا ہے"

"اے ہے تو مت دیجیئے زیور ۔" اپنے حسابوں شہلا نے فیصلہ سنایا ۔ کون سی ضروری چیز ہے ۔ کپڑوں کا تو یہ ہے کہ تن ڈھانکنا ضرور ہے زیور کا کیا ہے ۔ ؟"

امی نے اسے غور سے دیکھا ۔ اسے ابھی دنیا کی اونچ نیچ ، اچھائی خرابی کی کوئی خبر ہی نہیں ۔ کیا مزے سے کہہ گئی ۔ "زیور کا کیا ہے ۔ ؟"

ذرا دکھ سے ہنس کر بولیں :

"تو بچی ہے بیٹی ، تجھے کیا پتہ بیٹی کے جہیز میں سونا دینا کتنا ضروری ہوتا ہے ۔"

" اور جس کے پاس نہ ہو ۔ تو ۔ ؟"

"تو بٹھا کے رکھئے عمر بھر بیٹی کو اپنے ہی پاس ۔"

"امّی میں عمر بھر آپ کے پاس ہی رہوں گی ۔" پتہ نہیں پیچھے سے غزالہ کب سے آ کر بیٹھی ماں، بیٹی کی باتیں سن رہی تھی ۔ امی نے گھبرا کر دیکھا ۔ غزالہ ان کے گلے لپٹ پڑی تھی ۔

"امّی میرے وجود کو آپ بوجھ نہ بنائیے ۔ بس سچ کہتی ہوں ۔ میں آپ کو دکھی نہیں دیکھ سکتی ۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کا غم مجھ سے چھپا ہوا ہے ۔ ؟" آنسوؤں نے اس کے گلے میں گرہ سی ڈال دی ۔

امی نے اسے زور سے گلے لگا لیا ۔ بھرّائی آواز میں بولیں

"بیٹی تو سمجھتی ہے کہ تجھے عمر بھر اپنے پاس رکھ کر سکھی رہ سکوں گی ۔ ؟ بیٹیاں تو اپنے گھروں ہی میں ہنستی بولتی بھلی لگتی ہیں ۔ جہیز وہیز کا تو یہ ہے بٹیا کہ دنیا والوں نے جو رسمیں بنا لی ہیں، ان سے بچاؤ ممکن ہی نہیں ۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ تیرے سسرال والوں نے تو صرف پچاس تولے سونے کے زیوروں کا ہی مطالبہ کیا ہے لوگ تو بنگلے اور گاڑیاں تک مانگتے ہیں ۔"

"تو امّی ۔ کیا دولہا بھائی یہ زیور پہنیں گے ؟" شہلا نے معصومیت سے پوچھا ۔

"ارے نہیں بٹیا ۔" امی ذرا سا مسکرائیں ۔ "یہ تو مانگنے کے ڈھنگ ہیں ۔ مہذّب اور تعلیم یافتہ لڑکے والے کچھ یہ کہہ کر تھوڑی مانگتے ہیں کہ ہمارے لڑکے کو دے دیجئے ۔ وہ تو یہی کہتے ہیں کہ اپنی ہی بیٹی کو دیجئے ۔ مگر کام تو انہی کے آتا ہے ۔ ایک دم وہ بکھر گئیں ۔

"بالشت بھر کی چھوکری ۔ تجھے کیا پڑی ہے ری اتنی ساری باتیں

کھو جنے کی ۔"

شہلا ڈانٹ کا اثر لئے بغیر ہنستی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی ۔

"اے ری بجو!۔" وہ بڑی بہن کو سناتی ہوئی بولی ۔ پازیب میں گھنگھرو ضرور لگوایئے گا۔ دولہا بھائی پہن کر ناچیں گے تو سچ بڑا مزہ آئے گا ۔"

غزالہ سسک کر رہ گئی۔

شہزادوں کی سی آن بان والا ۔ بظاہر اتنا رحم دل اور فرشتہ صفت نظر آنے والا ۔ کیا سچ مچ اتنا بے رحم اور جلاد بھی ہو سکتا ہے اس کی آنکھوں کے آگے آج سے چند ماہ پہلے کا وہ خواب ناک منظر گھوم گیا۔

اس کی بے حد پیاری سہیلی رخشاں کی شادی کی حسین تقریب تھی اللہ کا دیا سب ہی کچھ تھا ۔روایتی شہزادیوں کی سی زندگی اس نے گزاری کالج میں ایک سے ایک کپڑے، زیور پہنے لمبی سی گاڑی میں آتی ۔۔ اور اب شادی بھی اسی تام جھام سے ہو رہی تھی کہ پیسے کی جگہ اشرفی اٹھائی جا رہی تھی ۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دونوں سہیلیوں کے رہن سہن میں زمین آسمان کا سا فرق ۔ ایک کے ہاں دولت پانی کی طرح بہتی تھی اور دوسری کے یہاں بس یہ تھا کہ تن بھر پہن لینا اور پیٹ بھر کھا لینا ہی زندگی کی معراج تھی ۔ لیکن اسکول سے ساتھ پڑھی ہوئی دونوں سہیلیاں پیار کی زنجیر میں ایسی بندھی تھیں کہ کبھی تو امیری ان کے بیچ نہ آئی ۔ اور شاید اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ رخشی نے کبھی غزالہ کو حقیر نہ سمجھا، نہ کبھی غزالہ نے رخشاں سے دوستی کے ناطے کوئی چیز لینے کے بارے میں سوچا۔ حالانکہ رخشاں

اس قدر چاہتی تھی کہ کبھی تو غزالہ کو عید بقرعید پر تحفہ بنا کر ہی کوئی چیز دیدے لیکن غزالہ نے ہمیشہ ایک پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ یہی جواب دیا۔

"دیکھ رخشی، مجھے ایسی چیز دے جو جواباً میں بھی دے سکوں۔ ورنہ تیری میری دوستی ختم —" اتنی پیاری دوست کو وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیئے ہمیشہ خاموش رہ جاتی — لیکن آنا جانا دونوں کا ایک دوسرے کے ہاں لگا رہا اور اب شادی جیسے موقع پر تو ناممکن تھا کہ غزالہ نہ آتی — جس دن سے رخشی مایوں بیٹھی - غزالہ صبح آجاتی اور رات گئے تک واپس جاتی —

اس دن رت جگا ہونے والا تھا۔ رخشی کے سسرال والے "ابٹن کھیلنے" آنے والے تھے — ابٹن کا تو محض نام ہوتا ہے، ایسے موقع پر جو چیز جس کے ہاتھ پڑ جائے اٹھا کر وہ مارا ماری ہوتی ہے کہ پوچھئے مت اب بھی شادی بیاہ میں بھی یہ سب چہ چہلے نہ ہوں تو وہ شادی ہی کیا۔ لیکن غزالہ کے ساتھ ساری مصیبت یہ تھی کہ اس سارے ہنگامے سے بے خبر وہ بس آنگ کے جوڑے سے چلی آئی تھی — اور اگر ابٹن ہلدی مسالے کی ہولی سے وہ بھی رنگ دار ہو جاتی تو اتار کر کیا پہنتی —؟ رخشاں سے لاکھ دوستی تھی وہ اس کے کپڑے زیور کبھی نہیں پہنتی تھی — اسی مارے جب رات کے سات آٹھ بجے دولہا والوں کی آمد کا شور مچا اور صندل ابٹن، مہندی اور سبزیوں کے تھال کے تھال اتارے جانے لگے، تو غزالہ گرمی کا بہانہ کر کے دھیرے دھیرے باغ سے کھسک گئی سوچا تھا جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، تو وہ بھی چلی آئے گی۔ لیکن اسے پتہ نہ تھا کہ ایک ہنگامے سے نپٹنے کے لئے سب سے ہنگامہ خیز، سب سے

دلکش، سب سے خوبصورت اور سب سے مبارک لمحے سے دوچار ہونا پڑے گا۔

وہ موتیا کی ننھی ننھی جھاڑیوں میں گھسی بیٹھی تھی کہ پیچھے سے ایک شور قہقہوں کی گونج اور غل غپاڑہ لئے ہوئے اٹھا۔ اور کوئی پناہ لینے کی خاطر عین اسی جگہ آرکا جہاں وہ چھپی بیٹھی تھی۔

یہ محض افسانوی بات نہیں ہے کہ قدرت غریبوں کو حسن بخشنے کے معاملے میں بڑی فیاض ثابت ہوئی ہے — یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت کی جیتی جاگتی مثال غزالہ تھی — جس کی شربتی آنکھیں بنا کاجل سرمے کے اتنی بڑی بڑی اور کھنچی کھنچی محسوس ہوتیں جیسے کسی کے چہرے پر اٹھ جائیں گی تو تلوار کی کاٹ سے بھی زیادہ قاتل ثابت ہوں گی۔ بال گھنے بھورے بھورے۔ اتنی لانبی چوٹی اس کی پیٹھ پر جھولتی رہتی کہ پتہ نہ چلتا کہ آخر اس چوٹی کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے — رنگ وہی رنگ تھا جس کے بارے میں لوگ سوچتے ہیں کہ شائد میدے میں دودھ اور گلابوں کا عرق ملا کر گوندھا گیا ہے — چھوٹی سی غیور ناک تھی جو کسی کے آگے نہیں جھکتی تھی — اور مخمل ایسے نتھنے میں چھوٹی سی کیل جگر مگر کرتی رہتی تھی۔ اور پھر دو بھرے بھرے ہونٹ جو برابر مسکراتے رہتے تھے۔ اور وہ سراپا تھا جو باغ میں نکل جاتا ہے تو سرو سر اٹھانا بھول جاتے ہیں تو یہ منصور میاں بھلا کیا حقیقت رکھتے تھے کہ ایسی رسمسائی کلی کو دیکھتے اور بھنورے نہ بن جاتے۔

وہ آئے تھے کہ کپڑے خراب نہ ہو جائیں — کپڑے تو بچ گئے مگر دلِ خانہ خراب کی وہ خرابی ہوئی کہ وہ مبہوت سے ہو کر رہ گئے — پہلے تو

اُنہیں یہی خیال آیا کہ شائد وہ جنّت کے کسی گوشے میں ہیں اور سامنے کوئی حور بیٹھی ہے ۔۔ پھر خیال آیا وہ کہاں کے بڑے نیک تھے کہ جنّت عطا ہوتی ۔ ہڑبڑا کر انھوں نے دھیرے سے اپنی انگلی میں کاٹا ۔ پھر اس حقیقت کا احساس ہوا کہ "یہ جنت نہیں ہے بھائی ۔ یہی اپنی دنیا ہے ۔ اور سارا قصّہ یہ ہے کہ آج تمہاری بہن کی شادی کا ہنگامہ ہے ۔ اور تم ابٹن چکنے مسالے اور صندل کی مار سے بچنے کے لئے یہاں آکر چھپے تھے کہ تمہیں پتہ چلا کہ حوریں جنت ہی میں نہیں ۔ ہماری تمہاری دنیا میں بھی ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں ۔" (غزالہ بیٹھے بیٹھے مسکرا اٹھی ۔ بعد میں اپنے احساسات منصور نے اسے اس انداز سے بتائے تھے ۔ کہ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی ۔)

انھوں نے بڑے غور سے اسے دیکھ کر بظاہر لاتعلق انداز میں پوچھا تھا ۔ "آپ کون ہیں ۔ ؟ اور یہاں کیا کر رہی ہیں ۔ ؟

وہ ہنس کر بولی تھی ۔

"وہی جو آپ کر رہے ہیں ۔ یعنی لوگوں سے چھپ کر بیٹھی ہوں ۔ میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے ۔ اتنی اچھی ساڑی پر ہلدی مہندی کے دھبّے پڑ گئے تو مصیبت ہو جائے گی ۔" وہ معصومیت سے بول رہی تھی

"اتنی اچھّی ساڑی ۔ ؟" منصور کا دل رحم سے بھر گیا ۔ جس ساڑی کو وہ اتنی اچھی ساڑی گن رہی تھی وہ بمشکل پچاس ساٹھ روپے کی ہوگی ان کا جی چاہا ۔ دنیا کا ہر قیمتی سے قیمتی کپڑا لا کر وہ اسے سجا سنوار کر اپنی دلہن بنالیں ۔ لیکن وہ بس ہنس کر رہ گئے ۔

"مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند آ[ئی] کہ مجھے دیکھ کر آپ تمام لڑکیوں

کی طرح بناوٹی شرم کا احساس کر کے "اوئی اللہ" کہہ کر بھاگیں نہیں۔

وہ ذرا فخر سے بولی۔ "اگر بی اے پاس کرنے کے باوجود بھی میں اس قسم کی شرم کا مظاہرہ کروں تو عجیب سی بات ہوگی۔ ویسے آپ مجھے کھا تو نہیں جائیں گے نا، اتنا یقین ہے اسی لئے اطمینان سے بیٹھی ہوں۔"

"آپ رہتی کہاں ہیں ۔؟" انھوں نے اٹ پٹا سا سوال کیا تھا۔

"اس جگہ سے چھٹا گھر... پھر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شی" کہہ کر خاموش رہنے کا اشارا کر دیا تھا ۔" اب آپ خاموش رہئے۔ بھئی آواز سن کر ورنہ لوگ ادہر آجائیں گے ۔" وہ سرگوشی میں بولی تھی ۔ اور پھر وہ ہلکی سی اس کی ہنسی، (تم کہو تو میں زندگی بھر خاموش رہ کر تمہیں یوں ہی تکتا رہوں

ارے حد ہوگئی ۔ یعنی کہ بالکل ہی حد ہوگئی کہ وہ جو اسے جنگل جنگل صحرا صحرا ڈھونڈنے کا جتن کر چکے تھے، ان کی اپنی بھتّو رخشی کی عزیزانہ جان سہیلی ثابت ہوئی ۔ اور جب رخشی سے اسے پتہ چلا کہ وہ جو اس کے بے حد پیارے بھیّا ہیں، جو مدتوں سے لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں۔ جواب اس کی شادی کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں اور یوں اس کے دیوانے بن بیٹھے ہیں تو اس نے سوچا" اللہ یہ کہانیوں اور افسانوں کی ہیروئینوں کی طرح کا اتفاق میری زندگی میں ہی ہونا رہ گیا تھا کہ ایک جگری سہیلی کا بھائی لندن میں پڑھتا ہے۔ بہن کی شادی پر ہندستان آتا ہے۔ عین شادی کے دن ایک حسین لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے جو اتفاقاً بہن کی سہیلی ثابت ہوتی ہے، اور آگے ۔؟ خیر یہاں تک تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب ۔

لیکن یہ بھی سوچا کہ یہ شادی کے بندھن کچھ اور بھی مانگتے ہیں — یہ دو سہیلیوں کا پیار تو نہیں ہے جس میں اونچ نیچ اور چھوٹائی بڑائی اور امیری غریبی کا دخل نہ ہو — اور یہ کوئی فلموں والی بات بھی نہیں کہ لکھ پتی ہیرو نے غریب ہیروئن سے شادی کرلی — یہ ہماری آپ کی جیتی جاگتی دنیا کی واردات ہے، جہاں کے قاعدے قانون کچھ اور ہی ہیں — تو بس یہاں سے آپ کے اور میرے رشتے ختم —!

لیکن یہ رشتہ شائد ختم ہونے والا نہیں تھا۔ کیوں کہ تھوڑے ہی دنوں بعد اُمی اور خود وہ بھی سُن ہی رہ گئیں جب ایک دن بہار کی ایک رسمساتی شام کو منصور میاں خود اکیلے ہی چلے آئے اور اس کی امی کو خالہ جان کا رشتہ لگا کر بڑی معصوم سی بے باکی سے اپنا مدعا کہہ ڈالا۔

"میں ماشاء اللہ ایک ڈاکٹر ہوں خالہ جان یقین کیجئے آپ کی بیٹی کو ہر طرح سے خوش رکھوں گا۔ اور جہاں تک خاندان اور ہڈی کا سوال ہے تو رخشی کو تو آپ مدتوں سے دیکھ رہی ہیں — میں اسی کا تو بھائی ہوں۔"

امی بولیں تو کیا۔ بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکیں "بٹیا وہ تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن مخمل، مخمل ہی ہوتا ہے اس میں ٹاٹ کا پوند بھلا نہیں لگتا۔"

انھوں نے جھٹ سے خود کو ٹاٹ بنا ڈالا — "ارے خالہ جان ایسا ویسا ٹاٹ نہیں ہوں۔ یہ مجھے پتہ ہے آپ کی بیٹی بہت اعلیٰ مخمل ہے لیکن

امی بے چاری "ارے ارے" ہی کرتی رہ گئیں۔

اور اس کے بعد پے در پے ایسے واقعات ہوتے چلے گئے کہ وہ سمجھ

ہی نہ سکی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ جیسے خواب کی سی ادھ سوئی ادھ جگی کیفیت سے وہ گزرتی ہی۔ تقریباً ساری باتیں طے ہو گئیں۔۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ جو جہیز کا تھا وہ بھی بخیر و خوبی" طے ہو گیا۔ ان دنوں وہ اپنے آپ میں کھوئی رہتی، ۔۔ اسے یقین نہ آتا کہ قدرت یکایک اس پر اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے۔؟ ابا کی اچانک بے وقت موت اسے یاد تھی بھائی کوئی تھا نہیں۔ پہاڑ جیسا آبائی گھر تھا جس میں بیٹے کے بیوہ امی اور دونوں بہنیں ڈھنڈلایا کرتیں۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ زخم کچھ مندمل ہونے لگے، ۔ ساتھ والا حصہ امی نے کچھ کرائے پر اُٹھا دیا۔ دونوں بچیاں اسکول کالج چلی جاتیں اور وہ گھر کی پرانی ماما بوا کے ساتھ گھر کے کام کئے بعد، سلائی بنائی کرتی رہتیں۔ اسکول کالج کی فیس اور گھر خرچ سے جو بھی پیسہ بچتا وہ لڑکیوں کے جہیز کے جتن کیا کرتیں۔ انھیں پتہ تھا، دنیا دیکھے بیٹھی تھیں کہ آج کل ہر شے کی طرح لڑکوں کے بھی اونچے دام لگتے ہیں۔ جو لڑکا جتنا زیادہ پڑھا لکھا ہے اس کے ماں باپ اتنے ہی زیادہ دام بھی مانگتے ہیں ۔۔

"ہم نے لڑکے کی پڑھائی لکھائی پر جو روپیہ اٹھایا ہے وہ ہم کہاں سے وصول کریں۔؟"

صرف شادی ہی تو ایک ایسا موقع ہوتا ہے جب سارے بدلے گن گن کر لئے جا سکتے ہیں ۔۔ اگر ایک بیٹی والے یہ مانگ پوری نہیں کر سکتے تو بھئی، ہمیں کیا پڑی ہے جو آپ کا منہ تکنے بیٹھیں! ہمارا بیٹا سلامت رہے ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی۔"

یہ اللہ کا شکر تھا کہ دونوں بیٹیاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت تھیں ۔ شہلا تو خیر چھوٹی تھی ، لیکن غزالہ کو کئی پیام آ چکے تھے ۔ وہ تو کہتے ہی ہیں کہ بیٹی کسی نہ کسی گن پر اُٹھ ہی جاتی ہے ۔ یا تو بھرپور پیسہ ہو ۔ یا بے پناہ حسن ہو ، یا اعلیٰ تعلیم ہو ۔ پیسہ تو بے چاری غزالہ کے پاس تھا ہی نہیں ۔ ہاں حسن تھا اور ایسا تھا کہ اندھیری رات میں چلنے لگتی تو راتیں روشن ہو جاتیں ۔ تعلیم بھی بُری نہ تھی ۔ اس حساب سے بہت سارے پیغام آ رہے تھے ۔ لیکن ماں کا دل تو ماں کا ہی ہوتا ہے ۔ جانتی تھیں کہ ایسی معصوم بچی ہے کہ عمر بھر دکھ ، سوکھا کھایا ، موٹا ، جھوٹا پہنا ۔ لیکن کبھی شکایت زبان پر نہ لائی ، اچھے دنوں کی آس نے کبھی بُرے دنوں کا گلہ نہ کرنے دیا ۔ اسی لئے چاہتی تھیں کہ کسی ایسے لڑکے کو دیں جو چار پیسے سے خوش ہو ۔ تاکہ دلہن کے کچھ تو ارمان پورے کر سکے ۔ ورنہ وہی بات ہوئی کہ چولہے سے نکلی ادہلے میں گری ۔ یہاں بھی گرمی وہاں بھی تپش ۔ اسی مارے اتنے پیام آتے بھی تھے تو بھی غزالہ کی رائے جاننے کی کوشش بھی نہ کی ۔ لیکن ڈاکٹر منصور کا پیام آتے ہی جیسے کوئی ان کے کان میں کہہ گیا ۔ " اب سوچ بچار نہ کرنا جہاں آرا ۔ یہی وہ سورج ہے جو تمہاری بڈیا رانی کے نصیبوں کو جگمگانے والا ہے ۔ "

اور سب سے عجیب و غریب بات تو یہ تھی کہ محبت کا تیر خود غزالہ کے اپنے دل میں بھی بری طرح گڑ گیا تھا ۔ اور پھر یہ ہوا تھا کہ جب بات پکی ہو گئی تو کئی بار ڈاکٹر منصور امی سے ملنے کے بہانے آئے ۔ امی کی موجودگی میں تو بس بیٹھے ہی بیٹھے آنکھوں ہی آنکھوں میں غزالہ کو نہارتے رہتے اور جیسے ہی وہ چائے پانی کے انتظام کو کچن کا رخ کرتیں ۔ یہ پروانہ وار غزالہ

پر فدا ہونے لگتے۔

"آپ شرمایئے نہیں خدا کے لئے اپنی پسند کا رنگ بتا دیجئے۔"

"دیکھئے آپ کی پسند کے زیور کیا ہیں؟"

"آپ کو گاڑی کے لئے کون سا رنگ بھلا لگے گا؟"

"ارے خدا کے لئے وہ دن سوچئے۔ جب آپ نے پہلی ملاقات میں کس بے خوفی سے میری ہر بات کا جواب دیا تھا۔ یہ پھر اب اتنے دنوں بعد آپ کو یکا یک شرم کیوں آنے لگی۔؟"

اور بغیر رُکے وہ اپنی زندگی کے بقول انہی کے سب سے حسین اور سب سے اہم دن کی واردات سنانے لگتے۔ اور یہ سب اس قدر بار ہو چکا تھا کہ غزالہ ہنسی روکتے روکتے دہری ہو جاتی۔ اور جیسے ہی امّی کے قدموں کی چاپ دور سے سنائی دیتی، جھٹ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتے۔ امّی آتیں۔ تو وہ یوں ہی بیٹھے پائے جاتے۔ وہ الٹا غزالہ کو لتاڑنے لگتیں۔

"گھر آئے مہمان کی خاطر تواضع تو گئی۔ اپنی جگہ سے ہلتی تک نہیں ہو۔ جاؤ چائے تو لے آؤ۔"

وہ کیسے کہہ دیتی "امّی میرا جی تو چاہتا ہے کہ خاک بن کر اُن راہوں میں بچھ جاؤں جہاں ان کے قدم پڑتے ہیں۔ اور آپ ہٹنے کی بات کرتی ہیں۔ نہیں امّی ایسا ظلم نہ کیجئے۔ خوابوں کے جس شہزادے کو میں نے مجسّم جاگتی آنکھوں پا لیا ہے، اس سے دوری کی بات نہ کیجئے اُمّی۔ پلیز اُمّی۔"

شادی اس لئے بڑھ گئی تھی کہ منصور میاں کا اپنا کلینک اور ڈسپنسری

تیار ہو رہی تھی ـــ یہ تو بڑی ہی عجیب سی بات ہوتی کہ بیٹا لندن سے ڈاکٹری پڑھ کر آئے اور نوکری کرتا پھرے ـــ اپنا ہاسپٹل ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ ان کی امی ممتاز بیگم اور اباجان صاحب اکلوتے بیٹے کی زندگی کو ہر طرح سنوارنا چاہتے تھے ـــ اسی لئے انھوں نے ان کی خوشی کی خاطر غزالہ کو اپنانا بھی قبول کر لیا تھا۔

لیکن شادی سے چند ہفتے پہلے جب دلہن کا ناپ کا جوڑا، دولہا والے لے جانے آتے ہیں - اسی دن امّی بے چاری پر یہ تلخ حقیقت بھی کھلی کہ بھلے سے انھوں نے غریب گھر کی بیٹی کو بہو کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی لگا دی ہے کہ کم سے کم پچاس تولے سونا جہیز میں ضرور ملے ۔

امّی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ممتاز بیگم ایک ایسی نرمی سے جو سختی سے کم نہیں ہوتی، کہہ رہی تھیں ۔

" دیکھئے بہن، ہمارا آپس کا معاملہ تو جو بھی ہے ٹھیک ہے۔ ہمیں خود کسی چیز کی ضرورت نہیں - اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اور بہت کچھ ہے لیکن دنیا والے تو یہ بھی پوچھیں گے نا کہ بہو کو جہیز میں کیا ملا - اب بہن دنیا دکھاوے کو چار لوگوں میں کچھ تو ہو - تو آپ زیادہ نہیں تو کم سے کم یہی پچاس ساٹھ تولے سونا تو بھی ضرور دیں۔"

یہ ایسی التجا تھی جو حکم سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

امّی نے سنبھل کر جواب دیا - " جی ہاں میں سب سمجھتی ہوں ۔"

رخشاں نے جو بھاوج کے جوڑے کا ناپ لینے ماں کے ساتھ آئی تھی

ماں کو ذرا ٹیڑھی آنکھوں دیکھا مگر وہ صفا ٹال گئیں۔

کسی کام سے جہاں آرا کچن میں گئیں تو رخشی بھی پیچھے ہی لپکی ہوئی گئی اور معافی بھرے لہجے میں بولنے لگی۔

"امی پلیز آپ ممی کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے گا۔ زیور کے چکر میں آپ مت پڑیئے۔ بھائی جان نے غزالہ کو جس دن سے دیکھا ہے۔ بس وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ تن کے جوڑے سے سہی اسے بیاہ لے آئیں۔"

"نہیں بٹیا ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں بہن۔" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ "یہ مکان پھر کس دن کام آئے گا۔ شکر ہے کہ یہ ذاتی تھا جو کرائے کا ہوتا تو اتنی آس بھی نہ ہوتی۔" غزالہ نے ساری باتیں سن لی تھیں۔ اور اس کے دل میں جو خوشیوں اور بہاروں کی فصل لہلہا رہی تھی جیسے اسے پالا مار گیا۔

یہ ایک گھر ہی تو تھا، جس کے سہارے ہم لوگوں کی زندگیاں گزریں اور ابھی شہلا اور امی کی ساری آس اسی پر تو ہے۔ یہ لوگ اتنے پیسے والے ہو کر محض اپنی شان اور عزت کے رکھ رکھاؤ اور جھوٹے وقار کی خاطر جو اتنا بڑا مطالبہ کر رہے ہیں تو پتہ نہیں شہلا کے سسرالی آگے چل کر کیا کچھ مانگیں۔؟ اس وقت تک تو امی اور بوڑھی ہو جائیں گی۔ وہ کیسے ایسے غم سہار سکیں گی۔؟ نہیں نہیں بہتر یہ ہے کہ یہ کچے دھاگے آج ہی توڑ دیئے جائیں۔ ٹھیک ہے میں انھیں اتنا چاہتی ہوں کہ آج تک شائد اس زمین پر کسی عورت نے کسی مرد کو اتنا نہ چاہا ہو گا۔ لیکن کسی کی چاہت، کسی کی زندگی کا مول تو نہیں ہو سکتی نا۔ میں امی کے بوڑھے دم کو

یہ دکھ نہیں دے سکتی۔

اور اگلی ملاقات پر جو کچھ ہوا وہ غزالہ کو مار ڈالنے کے لئے کافی تھا لیکن یہ اس کی سخت جانی ہی تھی کہ وہ مر نہ سکی۔

وہ اپنے کمرے میں تھی، پتہ نہیں منصور کب سے امّی کے پاس آئے بیٹھے تھے۔ وہ کسی کام سے امی کے کمرے میں آئی تو انھیں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔ شادی کو جیسے جیسے کم دن رہ رہے تھے فطری حیا اور شرم اسے منصور سے دور کئے دے رہی تھی۔ اب انھیں دیکھ کر وہ اتنی شرما جاتی کہ قدم نہ اٹھتے۔ شرما کر وہ اُلٹے پاؤں لوٹ آئی۔ تھوڑی دیر بعد منصور ہی اس کے کمرے میں چلے آئے۔

"خالہ جان چائے بنانے ادھر گئیں اور ادھر میرے نصیب جاگ گئے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھنے لگے۔

وہ دُور ہٹ گئی۔ منصور پیار سے ہنسنے لگے۔"

"دیکھئے۔ زمین آسمان نہ کبھی ملے ہیں نہ مل پائیں گے۔" وہ بڑے ہی دکھے لہجے میں بولی۔

"بھئی آپ تو آج ڈائیلاگ بول رہی ہیں۔ ہوا کیا؟"

"آپ کو پتہ ہے آپ کی ممّی نے کیا مانگ کی ہے۔ اور وہ مناسب الفاظ میں سب کچھ سنا گئی۔ وہ منتظر تھی کہ اب منصور یہ کہیں گے۔ "نہیں غزالہ یہ نہیں ہو سکتا۔ سونے کی اس حقیر ڈھیری کے لئے میں اپنے ارمانوں کو آگ نہیں لگا سکتا۔۔" لیکن منصور کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اس کے کان سن سے رہ گئے۔

"ڈاکٹر منصور جیسے شوہر کو پانے کے لئے ایک چھوٹے سے مکان کی قربانی ایسی کون سی بڑی چیز ہے۔"

"جی۔!؟" اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھیلتی ہی چلی گئیں۔ "یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ آپ؟"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ آنسو روکنے کی کوشش میں اُلٹی سسکیاں نکلنے لگیں۔ ڈاکٹر منصور اس صورتحال کے لئے قطعی تیار نہ تھے، وہ سراسیمہ سے تھوڑی دیر تو یوں ہی بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر چل دیئے۔

کتنے ہی دن یوں ہی گذر گئے۔ وہ دن اور آج یہ دن! لیکن سب سے عجیب بات تو یہ ہوئی کہ جب اس نے امّی کے سامنے شادی سے صاف انکار کر دیا تو انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"بیٹی۔ ایک ہی بات کہتی ہوں اگر تم نے اس شادی سے انکار کیا تو میں زہر کھا کر سو جاؤں گی۔"

پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بڑی الجھن میں بولیں۔ "میں تمہارے احساسات سمجھتی ہوں۔ لیکن بیٹی میں منصور جیسے بیٹے کو کھو نہیں سکتی۔ وہ ہیرا ہے ہیرا۔"

اس کا جی چاہا زور زور سے چلّا چلّا کر ہنسے۔ "واہ رے واہ ہیرے۔" لیکن ہنسی کے بجائے اس کے آنسو نکلنے لگے۔ کیسی عجیب مصیبت میں جان تھی۔ امی کا خیال مرنے بھی تو نہیں دیتا اللہ۔

شادی ہوئی اور اسی دھوم دھڑکے سے ہوئی جیسی دولہا والے

چاہ رہے تھے ۔۔۔ دلہن کے جہیز میں چم چم چمکتے سونے کے کئی زیور تھے ۔ بستر کپڑے لتے تو خود امّی برسوں سے تیار کرتی رہی تھیں ۔ ہر کوئی غزالہ کے نصیب پر رشک کر رہا تھا۔ لیکن خود غزالہ آنسوؤں میں ڈوبی سوچ رہی تھی کہ " میرے خدا کیا میری محبت کا یہی انجام ہونا تھا۔ ؟ میں کس طرح ایک ایسے شخص سے پیار اور نباہ کر سکوں گی ۔ جسے جھوٹی عزت اور دکھاوے کی شان کا اتنا شوق ہے کہ کسی کے زندگی بھر کے اثاثے اور آسرے کو ختم کر دیا ۔۔۔ میرے اللہ امّی اور شہلا کا گزارہ اب کیسے ہوگا؟" ایک ایک خیال آتا اور رہ رہ کر اس کے آنسو بہنے لگتے ۔۔۔ ڈاکٹری کا پیشہ تو رحمدلی سکھاتا ہے ۔۔ یہ شخص کیا مریضوں کی دل جوئی کرے گا ۔ ؟ جو دل توڑے وہ کسی کا دل کیا جوڑ سکتا ہے ۔۔۔ اتنے امیر ماں باپ کے بیٹے تھے اگر کہہ دیتے مجھے سسرال سے کچھ نہیں چاہیئے۔ تو کیا اکلوتے بیٹے کی بات ماں باپ نہ مان لیتے ؟ لیکن جس کے اپنے دل میں لالچ بھرا ہو وہ کیا دوسروں کو راستہ دکھا سکتا ہے ۔۔ ؟ سہاگ رات سی خوبصورت رات جو زندگی میں صرف ایک بار ہی آتی ہے کیا میری زندگی میں اسی صورت سے آنی تھی کہ اپنے ہونے والے دولہا کی صورت تک دیکھنے جی نہ اُمڈے ؟"

آنسوؤں نے سارا سنگھار دھو دیا ۔ جب پھولوں سے سجی سنوری کار دروازے سے لگی تو نئے سر سے غزالہ کو بھی سنوارا سجایا گیا ۔ جب تھوڑی دیر کے لئے کمرہ خالی کر کے دلہن کو آرام پہنچانے کی خاطر اکیلی بٹھایا گیا ۔ تو امّی آنسو بھری آنکھیں لئے ان کے پاس آئیں اور بھاری

گلے سے بولنے لگیں۔

"بیٹی تم بہت خوش قسمت ہو کہ منصور جیسا شوہر تمہیں ملا ہے کاش میرے ہندستان کے سارے لڑکے میرے بیٹے منصور کی طرح ہو جائیں ....."

غزالہ نے ذرا غصّے سے ماں کی طرف دیکھا تو وہ سسک کر بولیں "بیٹی وہ جہیز لین دین، جھوٹی عزّت شان اور دکھاوے سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں، ساتھ ہی دوسروں کے جذبات کا اتنا ہی خیال بھی — یہ بات میں تم سے آج بتا رہی ہوں بیٹی — اپنے ماں باپ کے پچاس تولے سونے کے مطالبے کو وہ رد بھی نہیں کر سکتا تھا تو یہ اس دن کی بات ہے جس دن تم نے میرے پاس آکر شادی سے انکار کیا تھا۔ اسی وقت میرے پاس تمہارے جہیز میں دینے کے لئے پچاس تولے سے بھی زیادہ کے زیور لایا تھا۔ میرے لاکھ منع کرنے پر بھی نہ مانا اور مجھے اپنے سر کی قسمیں دی تھیں کہ یہ بات کم سے کم شادی تک غزالہ کو نہ معلوم ہونے پائے۔ ورنہ وہ غیرت کے مارے یا تو شادی سے انکار کر دے گی یا اپنی جان کو کچھ کر بیٹھے گی — آج تمہاری شادی کی رات میں اس قسم کے حصار سے نکل رہی ہوں بیٹی — خدا کے حوالے تم دونوں کو کرتے ہوئے تڑپ کر دعا مانگتی ہوں کہ اللہ تمہاری کوکھ سے بھی ایسے ہی بیٹے جنم لیں جو دنیا کی ہر بری رسم اور لعنت کو اسی طرح ختم کرنے کا جتن کریں — وہ انسان سے بھی بڑھ کر انسان ہے — شائد فرشتوں سے بھی زیادہ عظیم ہے۔ ورنہ یہ سوچنے کی بات ہے بیٹی کہ اس جیسے خوبصورت

پڑھے لکھے، دولت مند اور فرشتہ صفت لڑکے کو لڑکیوں کی کیا کمی تھی؟
وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ماں باپ کی بات پوری نہ ہو ــ تمہیں بھی حاصل کرنا چاہتا تھا ــ تمہاری غیرت کا بھی سوال اس کے دل میں تھا. اور مجھے زندہ درگور نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ میں نے رو رو کر اس سے کہا کہ "بیٹا مجھے یہ بھیک مت دو ــ" تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھی سے اُلٹا سوال کیا تھا۔

"امی ــ آپ مجھے بیٹا کہتی ہیں نا ــ آج سے میں خالہ جان کے بجائے آپ کو امی جان کہتا ہوں ــ بتائیے ایک بیٹا کبھی ماں کو بھیک دے سکتا ہے۔ ؟" پھر اس نے مجھے یقین دلایا کہ اس بات کا علم نہ اس کی ممّی کو ہے نہ پاپا کو ــ اور کہا کہ میں یہ بھی چاہوں گا کہ اس کا علم غزالہ کو کبھی نہ ہو ــ تاکہ وہ اپنے آپ کو کسی طرح کمتر نہ محسوس کرے ــ وہ آسمان ہے ــ اُسے آسمان ہی رہنے دیجئے ۔"

غزالہ نے گھبرا کر سر اٹھایا ــ آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے ۔برسے جا رہے تھے ۔ لیکن دل میں بس یہ ارمان مچل رہے تھے کہ کب موقع ملے اور دل اس فرشتے کے حضور سجدوں میں جھک جائے ۔

سونا چاندی

"ہائے اللہ اپیا آپ دلہن بن کر کتنی خوبصورت لگیں گی۔"
شاہینہ کے گھر میں داخل ہوتے ہی زرینہ اس کے گلے سے جھول گئی۔ مارے خوشی کے اس کے گال سُرخ ہو رہے تھے۔ اپیا کے دلہن بن جانے کے تصور سے خود اس کا اپنا روپ نکھر اُٹھا تھا۔

"ارے اللہ یہ کیا مصیبت آن پڑی آخر۔" شاہینہ اس کے ہاتھ اپنے گلے سے الگ کرتی ہوئی بولی۔ "صبح تک تو تم اچھی خاصی تھیں۔"

"اُوہ بے چاری کو جیسے معلوم ہی نہیں کہ جلد ہی ہمارے انگنا میں ڈھولک بجنے والی ہے۔" اور وہ مارے اتراہٹ کے میراثنوں کے انداز میں گانے لگی۔

"دولہا گاؤں کا گنوار دلہن بولتی بھی نہیں" شاہینہ کی ہنسی چھوٹ گئی — "دولہا گاؤں کا گنوار؟؟ وہ خود ان دنوں ایم - اے کا امتحان دے رہی تھی — بس آج کل آخری پرچے چل رہے تھے — اور یہ سن گن تو بہت دنوں سے اس کے کان میں پڑ رہی تھی کہ ادہر اس کا امتحان ختم ہوا کہ وہ مایوں بٹھائی گئی — ظاہر ہے ایک ایم-اے- پاس لڑکی کے تعلق سے سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اسے کسی گنوار کے پلے باندھ دیا جائیگا — اور یہ زرینہ —؟ اپنی اچھی خاصی پڑھی لکھی آپیا کو نے کے جنے کس گنوار کے پلے ڈالنے جا رہی تھی — شاہینہ کو ہنستا دیکھ کر زرینہ اچانک بول پڑی

"اچھا آپیا اگر سچ مچ ہی دولہا بھائی اک دم گنوار نکل آئے تو آپ کیا بگاڑ لیں گی ان کا —؟"

شاہینہ شرارت سے ادہر ادہر دیکھنے لگی کہ کوئی سن نہ رہا ہو — پھر مسکرا کر بہن کے کان میں جھک کر بولی۔

"اری دیکھ لینا کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی —؟" ہاں!" اور دونوں بہنوں کے ہنسی کے قہقہے دور تک جگمگاتے گئے۔

اگلے دن پرچہ دے کر شاہینہ گھر لوٹی تو سارا گھر یہاں سے لے کر وہاں تک جھلملا رہا تھا — دالان، برآمدے آنگن سب مہمان بیبیوں سے پٹے پڑے تھے — طرح طرح کے رنگین، جھلملاتے چمکدار کپڑے، زیور، گہنے مہمان بیبیوں کے بچے، ان سے بھی بڑھے چڑھے کپڑے پہنے سارے میں غل غپاڑہ مچاتے پھر رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں بڑی سی میز کھلانے پینے

کی چیزوں سے لدی ہوئی تھی ۔ نوکر کام کم اور ہلڑ زیادہ مچا رہے تھے ۔ رہی سہی کسر میراثنوں نے پوری کردی تھی ۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر جانے کدھر کدھر کے بُرے بُرے گیت گائے جا رہی تھیں ۔ شاہلینہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی ۔ مہمان بیبیوں میں ہلکی ہلکی سی کھلبلی مچ گئی ۔

" ارے یہ کیسا تماشہ ہے ۔ منگنی کے دن بھی لڑکی گھر سے باہر ۔"

" اس میں بُری بات کون ہو گئی ۔ امتحان چل رہا ہے ۔"

" ارے بی بی شادی شدہ زندگی میں یہ موئے امتحان وتحان کام نہیں آتے وہاں تو بس میاں کی تابعداری بجانی پڑتی ہے ۔ ایک مہمان بی بی نے گود میں لٹائے ہوئے بچے کو دھپا دھپ کوٹتے ہوئے نئی زندگی کا نقشہ کھینچا ۔

" اے واہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیچاری امتحان ادھورا چھوڑ دیتی ۔"

" ارے اللہ سسرال والوں کو جلدی تھی ۔ ان کے صاحبزادے اپنے کام دھام کے سلسلے میں آج ہی رات کی گاڑی سے دہلی جا رہے ہیں ۔ سا بس کو ساروں میں منگنی کی انگوٹھی پہنانے دکھانے کا چاؤ تھا اس لئے گڑبڑ ہو گئی ۔"

ساری اُلجھی الجھی باتیں شاہلینہ نے راہ داری طے کرتے کرتے سنیں ۔ لوجھل قدموں سے جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اس کی بہت ساری خلیری ، ممیری بہنوں اور سہیلیوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ جھیل لیا ۔ زرینہ نے ایک زرتار ہرا جوڑا ، جو گوٹے کناری سے جھلملاتے سرپوش سے ڈھکے طشت میں سجا ہوا تھا ۔ شاہلینہ کے سامنے نچا دیا ۔

"اللہ اپیا بس جھٹ پٹ نہا کر یہ جوڑا بدل ڈالیے ورنہ آپ کی سسرال والیاں آجائیں گی۔" شاہینہ روکھی ہو اٹھی

"بھئی یہ کیا ہو رہا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔؟ میں کیوں ایسے بھاری بھرکم کپڑے پہن کر بے وقوف بنوں ا"

"اری بنو" بے وقوف نہیں دلہن بنو دلہن ۔ مگر آدھی، پوری دلہن اس وقت بننا جب دولہا میاں باجے گاجے کے ساتھ بارات لے کر آئیں گے ۔" ایک چچازاد بہن نے چھیڑ سے کہا۔

"ارے بھئی دراصل اسی لئے تو شاہینہ بور ہے کہ اس کا کہنا ہے کہ دولہا میاں آج ہی بارات لے کر آئیں ۔" شاہینہ نے مصنوعی، جھلاہٹ سے اپنی سہیلی کو دیکھا۔ مگر روکنے کے باوجود مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھا گئی ۔ مارے شرم اور خجالت کے اس کی آنکھوں میں گلابیاں تیر گئیں۔

تین چار لڑکیوں نے مل جل کر زبردستی اسے پکڑ کر، سنوار ہی دیا۔ باہر سے شور سنائی دینے لگا۔

"اری لڑکیو، جلدی کرو ۔ شام پڑ رہی ہے۔ اُدھر لڑکے کی گاڑی چھوٹنے میں بھی وقت کم رہا جا رہا ہے۔

"بس خالہ جان لا ہی رہے ہیں ۔"

" شاہینہ کا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔ اللہ جانے کیا ہونے جا رہا تھا۔ ایسا عجیب وغریب تجربہ تو اسے زندگی میں کبھی نہ ملا تھا۔ جی چاہ رہا صاف کہہ دے میں نہیں جاتی باہر۔ مگر اسی دم پھر امی کی آواز آئی ۔

"کھلے سرمت لانا ری لڑکیو۔"

"ارے خالہ جان ہم کوئی بے وقوف ہیں۔ دیکھ لیجئے آگے ہی گھونگٹ ڈال رکھا ہے"۔ اور ساتھ ہی اتنی ساری ذمہ داریاں بھی"۔ کسی شریر لڑکی نے ٹہوکا دیا۔

شاہینہ کا دل دہل کر رہ گیا۔

ہنسی ہنسی میں کس نے اتنی گہری بات کہہ دی ہے۔؟" اس نے سر اٹھا کر دیکھنا چاہا مگر ذمہ داریوں کے بوجھ کے احساس سے اس گردن اٹھ تک نہ سکی۔

منگنی کی رسم سے شادی کی تاریخ تک پورے دو مہینے باقی تھے ان دو مہینوں میں شاہینہ چاہتی تو کیا کچھ نہیں جان سکتی تھی۔ لیکن اس نے کسی سے اُلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ جسے میرا جیون ساتھی بنایا جا رہا ہے وہ ہے کیسا۔ بقول زرینہ کے گاؤں کا گنوار ہے، یا پڑھا لکھا۔ بزنس کرتا ہے یا نوکری۔ خاندان کیسا ہے۔ مزاج کیسا ہے۔ عادتیں کیسی ہیں۔ لیکن اس نے ہر بار یہی سوچا کہ جب امی اور ابا نے مجھ جیسی پڑھی لکھی لڑکی سے کچھ پوچھنا تک مناسب نہیں سمجھا ہے تو یقیناً وہ بھی پڑھے ہی لکھے ہوں گے۔ دیکھنے دکھانے میں بھی اچھے ہی ہوں گے۔ خاندان بھی اچھا ہی ہوگا۔ ان کا مزاج بھی اچھا ہی ہوگا۔ کوئی بھی ماں باپ کیا اولاد کا بُرا چاہتے ہیں۔! میں یہ سب کیوں سوچوں، ؟ کبھی کبھار خیالوں نے یلغار کی بھی تو اس کے دل کو بہلا لیا۔ اور آج اس کی شادی کا دن تھا۔

امنگوں، مرادوں اور امڈ خوشیوں کی وہ رات جو ہر لڑکی کی زندگی

میں بس ایک ہی بار آتی ہے۔ جس کے انتظار میں لڑکیاں جنے کیا کیا نہیں سوچتیں۔

باہر سے جب اس کے ماموں جان وکیل کو ساتھ لے کر ایک ہجوم سمیٹے گواہی لینے آئے تو وہ یوں کانپ کر رہ گئی جیسے تیز ہوا کے جھونکے سے پتہ۔

"بولو بی بی شاہینہ بعوض پچاس ہزار مہر سکہ رائج الوقت تمہیں اعجاز احمد۔ مگر اس کے کان کچھ نہیں سن پا رہے تھے۔ بعوض پچاس ہزار مہر۔۔۔۔۔

عوض۔ ؟ کیا وہ کوئی بکاؤ چیز تھی ؟ اور اگر بکاؤ تھی ہی تو کیا پچاس ہزار کی حقیر سی رقم اس کے وجود کا مول ہو سکتی تھی۔ ؟ کیا سونا چاندی اسے خرید سکتی تھی۔ ؟"

وہ اپنے ہونے والے شوہر سے ہر چیز کی توقع کر سکتی تھی، لیکن یہ کہ کوئی اسے سونے چاندی کا بدل دے کر خرید لے جائے۔ "اللہ پتہ نہیں جب ابتدا ایسی ہو رہی ہے تو انتہا کیا ہو۔ ؟"

جنے پاس ممانی بیٹھی تھیں یا خالہ۔ کئی آوازوں نے بیک وقت اسے مجبور کیا۔ " اری بٹیا یہ وقت تو سب ہی لڑکیوں پہ آتا ہے ہنکاری بھر دو بٹیا۔ دیر ہو رہی ہے۔"

کئی گرم گرم آنسو بیک وقت، اس کی کاجل بھری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ ہلکی سی " ہوں " نے جنگل میں اچھلتی پھرنے والی آزاد ہرنی کو پابہ زنجیر کر دیا

دولہا کی پھوپھی نے اس کی گوری گوری گردن میں کالی پوت کا لچھا باندھ دیا۔ کہ اس کے سہاگ کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

سب جھوٹ جھٹکے، موہنہ دکھائی، جلوے، آرسی مصحف کی رسومات سے نبٹنے کے بعد وداعی کی گھڑی آن پہنچی ۔ چار بجے سے جن سکھی سہیلیوں نے ہنسی مذاق دھوم دھڑکے کا بازار لگا رکھا تھا چھپ کر آنسو پونچھتی پھر رہی تھیں ۔ میراثنوں کے گیت ان کے اپنے گلے میں گھٹ کر رہے جا رہے تھے ۔ ہزار بار کے گائے گئے بابل اور وداعیاں نئے سرے سے آنسوؤں کے پھندے گلے میں ڈال رہے تھے ۔ امی بیچاری یہاں وہاں چھپتی پھر رہی تھیں ابا جو اپنے زمانے میں بڑے تیسے کے ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے ۔ آنسوؤں کو چھپانے کی سعئ لاحاصل کر چکے تھے ۔

" اللہ بیٹی کا جنم بھی کیا جنم ہوتا ہے ۔ لمحے لمحے کی دھکڑ پکڑ رہتی ہے " کسی بڑی بی نے آنسو پونچھتے ہوئے دہائی دی ۔

سسرال والیوں میں سے کوئی چلائیں ۔ اب وداعی کر دیجئے بہن پھر گھر جا کر بھی تو موہنہ دکھائی ۔ رسمیں کرنی ہیں ابھی ....

کسی چلبلی نے بات کاٹی ۔ " اور انہی ریتوں رسموں میں رات گزر گئی تو ہو گئی دولہا میاں کی چھٹی ....." کالج کی کوئی طرار لڑکی دھیرے سے بولی " اور چھٹی بھی ایسی ویسی کرسمس کی چھٹی ....

کوئی اور وقت ہوتا تو ایسے تیز تیز ہنسی مذاق کے جملے سن کر شاہینہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ جاتی ۔ لیکن اس وقت اسے کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا ۔ امی، ابا، زرینہ، چھوٹے بھائی، بڑے بھائی، بیک وقت سب ہی اس کے آنسوؤں کو راہ دے رہے تھے ۔ گھونگٹ میں اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا ۔ مگر وہ قدموں کی چاپ سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ ابا میاں قریب آ گئے

آگئے ہیں۔ اب انھوں نے اس کے بازو بیٹھے ہوئے دولہا میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ لے کر اپنا سیدھا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں پکڑا دیا ہے۔ اس کے ہاتھ پر چند گرم گرم قطرے ٹپک پڑے ہیں۔

شائد یہ ابّا میاں کے آنسو ہیں!!

ایک مجبور باپ کے مجبور آنسو — جو بچپن سے لے کر جوانی تک اپنی اولاد کو پال پوس کر بڑا کرتا ہے۔ اور خود ہی ایک اجنبی کے حوالے کر دیتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول کا یہی حکم ہے۔

آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں وہ بول رہے ہیں۔

اعجاز میاں — شاہینہ کی شکل میں اپنے دل کا گوشت پوست کا ٹکڑا تمہیں دے رہا ہوں — بیٹا ایک باپ ہونے کے ناطے میں نے ہر ممکن خوشی اپنی بچی کو دی ہے۔ اور میں تم سے امید کرتا ہوں کہ تم بھی اسے پھول کی طرح نازک جانوگے۔" آنسوؤں کے مارے ان کی آواز بیچ بیچ میں ٹوٹ جاتی ہے

"مجھے اپنی شاہینہ پر پورا اعتماد ہے کہ وہ ایک بہترین بیوی ثابت ہوگی یہ خوش فہمی نہیں بیٹا — یہ وہ اعتماد ہے جو دھیرے دھیرے کہیں برسوں میں سالوں میں جا کر اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے — وہ بیک وقت تمہارے دل کی رانی بھی بن سکتی ہے اور خادمہ بھی — مگر بیٹا ایک — صرف ایک نصیحت کرتا ہوں کہ کبھی عورت کا دل نہ دکھانا — عورت کا دل وہ دل ہوتا ہے جو پھول کی مار بھی نہیں سہہ سکتا۔ پھر شاہینہ تو ایسی لڑکی ہے جس نے کانٹوں کے بارے میں سنا تک نہیں میں نے آج تک پھول ہی پھول اسے دیئے ہیں — اور میں کیا کہوں بیٹا — اللہ نے آج تمہیں وہ درجہ دیا ہے

کہ تمہارے سامنے میری حیثیت کچھ نہیں ....

پھر انھوں نے گھونگھٹ ہٹا کر شاہینہ کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"میری بیٹی — میری گڑیا۔ خدا تمہیں دونوں جہاں میں شاد آباد رکھے۔ کبھی اپنے والدین کا سر دنیا والوں کے سامنے نیچا نہ ہونے دینا۔.....

"آج میں نے اعجاز میاں کا ہاتھ ہی تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا۔ بلکہ ہم دونوں کی زندگی کی ساری خوشیاں اس ہاتھ میں سمو دی ہیں — اتنا یاد رکھنا بیٹا — عورت ہی گھر کو جنت بناتی ہے۔ عورت ہی دوزخ بناتی ہے۔ میری بیٹی تم خود جنت کا ایک روپ ہو۔..

ایک باپ کو اپنی بیٹی پر کیسا بھرپور اعتماد تھا۔؟؟

شاہینہ سسک کر باپ کے کندھے سے لگ گئی جیسے اس کا رُواں رُواں پکار اُٹھا۔

"ابا میاں میں آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دوں گی۔ کبھی نہیں .... کبھی بھی نہیں ....

سہاگ رات اس کی توقعات کے بالکل برعکس نکلی۔ سارے خوبصورت اور جگمگاتے ہوئے خواب ایک ایک کر کے چوُر ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زندگی اس کے ساتھ اتنا بڑا ستم کرے گی — بات کچھ بھی نہیں تھی — اس نے ایک دو باتوں کے بعد ہی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ دولہا میاں کی باتوں، لب و لہجہ اور انداز میں کچھ

گنوارپن سا ہے ۔ رہی سہی کسر یوں پوری ہو گئی کہ جیسے ہی اس نے اپنے نازک اور خوبصورت ہاتھوں سے، ان کے شدید اصرار پر پان بنا کر پیش کیا تو وہ بے حد دیہاتی پن سے بولے۔

"سوری تھینک یو۔"

اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ۔ اب جو اس نے ڈرتے ڈرتے ذرا نگاہ اٹھائی تو جیسے اس کا دم ہی نکل گیا۔ دولہا میاں تھے تو بڑے خوبرو لیکن گنوارپن کا اور دیہاتی پن کا نمونہ ۔ اس وقت انھوں نے زرتار صافہ ۔ اچکن اور سلک کا کرتا، پاجامہ اُتار کر، گہرے گہرے رنگوں کا رات کا سونے والا لباس پہن رکھا تھا۔ ... اُسے اچانک یاد آیا دو ماہ پہلے زرینہ نے ایک ڈھولک کا گیت گا کر اسے ستایا تھا۔

دولہا گاؤں کا گنوار دولہن بولتی بھی نہیں ! اور پھر اسے یاد آیا۔

"اچھا اپیا اگر سچ مچ ہی دولہا بھائی ایک دم گنوار نکل آئے تو آپ کیا بگاڑ لیں گی ان کا ۔ ؟"

اور اسے اپنا جواب یاد آیا ۔ "اری دیکھ لینا کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی ۔ ہاں ۔"

اس لمحے سے آج کے لمحے تک کتنا فاصلہ اور فرق تھا۔ کیا... کیا وہ ایسا کوئی اقدام کر سکتی تھی۔

اسے تذبذب میں دیکھ کر دولہا میاں بولے ۔ "تم غصّہ ہو گئیں کیا ۔ ؟ دیکھو بھئی میں تم سے کچھ چھپاؤں گا نہیں ۔ اصل میں مجھے انگلش ونگلش کچھ آتی نہیں ۔ بس تھوڑی سی تعلیم پائی تھی ۔ اور ویسے

تعلیم کی ضرورت بھی کیا تھی ۔۔ ہمارا لکڑے کا بہت بڑا بزنس ہے۔ اتنا روپیہ ہے کہ سات پشتیں بھی ختم نہیں کر سکتیں ۔ اصل میں تمہارے ابّا اور امّی نے یہ رشتہ اسی لئے قبول بھی کیا کہ تعلیم وعلیم میں کیا دھرا ہے جو کچھ ہے پیسہ ہی تو ہے۔ پڑھ لکھ کر بھی انسان کیا کرتا ہے۔؟ دولت ہی تو کماتا ہے نا؟" پھر پڑھ لکھ کر خواہ مخواہ وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ ؟؟"

شاہینہ کا جی چاہا کہیں سے ایک بڑا سا لکڑا مل جائے تو اپنے سر پر مار کر قصّہ ہی ختم کرلے۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ زندگی نے اس پر امتحان کے نئے دروازے کھول دیئے ہیں ۔۔ وہ سر جھکائے سُنتی رہی۔

" اسی لئے ۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا ..... " کچھ عجیب دیہاتی پن سے جس میں معصومیت اور کچھ حماقت کی بھی چھاپ تھی دولہا میاں نے جھک کر نئی نویلی دلہن سے پوچھا ۔ "تم میرا ساتھ دوں گی نا شاہینہ ۔؟"

شاہینہ نے اپنی کانپتی پلکوں پر اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو بمشکل سنبھالا ۔۔ اور ڈوبتی آواز میں بڑی ہمّت سے بولی۔

" آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی ۔ انشاءاللہ!"

اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مونہہ ڈھانپ لیا۔

اعجاز کا بے حد اصرار تھا کہ ہنی مون کے لئے سارے ہندستان کا ٹرپ لگائیں ۔ لیکن شاہینہ سخت پریشان تھی ۔ وہ سوچتی جہاں بھی

جاؤں گی ملنے جلنے والے تو ہوں گے ہی - آخر اتنے سارے لوگوں سے اعجاز کو کیسے چھپاؤں گی ۔ اس کا لہجہ، بات چیت کا انداز، کپڑے پہننے کا طریقہ، ہر انداز اپنی جگہ نرالا تھا۔ اس کے اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے تک میں جو دیہاتی پن تھا وہ کیسے چھپ سکتا تھا۔ شاہینہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ چند مہینے بے حد ضبط کا مظاہرہ کرے گی - اور اعجاز کو سنوار لے گی - لیکن یہ امتحان بھی اپنی جگہ کتنا کڑا تھا ۔ بچہ ہو تو کوئی ڈانٹ بھی لے ایک اچھے خاصے جوان مرد کو ہر بات پر روکتے ٹوکتے اچھا بھی تو نہیں لگتا - کیا پتہ کس بات پر غصہ ہو بیٹھے ۔؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سسرال والے بگڑ بیٹھیں کہ آج تو بیاہ کر آئی ہیں اور آج ہی سے میاں پر ایسی حاوی ہو گئیں کہ انگلی پکڑ کر چلا رہی ہیں ۔ ویسے گھر میں زیادہ لوگ تھے بھی تو نہیں ۔ ایک ساس تھیں جو بڑی بے ضرر قسم کی تھیں - نماز روزہ کر کے زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتیں ۔ دو نندیں تھیں جو شہر میں ہوسٹل میں رہتی اور کالجوں میں پڑھتی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد ہی وہ شہر چلی گئیں - ایک دیور تھے جو لندن میں میڈیکل کر رہے تھے ۔ سسر تھے جو اکثر مردانے میں رہتے تھے۔ بس کھانے کے ٹائم پر گھر میں آتے تھے - گھر کیا تھا اچھی خاصی بڑی کوٹھی تھی ۔ جدید فرنیچر سے آراستہ پیراستہ - سامنے خوبصورت لان - باغ - سلیقے سے گارڈن چیرز لگی ہوئی ۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس گھر میں نہ ہو- ہر چیز کی ۔ روپے پیسے کی ریل پیل - سب کالجوں میں پڑھ رہے تھے - پھر پتہ نہیں شاہینہ بے چاری کے نصیبوں پر کیا خدا کی مار تھی کہ اتنی پڑھی لکھی لڑکی کو

جاہل شوہر سے سابقہ پڑا — ایک دن ایسے ہی گھما پھرا کر شاہینہ نے اعجاز سے پوچھا تو وہ بڑے دیہاتی انداز سے بولے۔ "ہیں بڑا تھا نا — لاڑ چونچلوں میں پڑھنے کا سوچا بھی نہیں۔ پھر بعد میں مجھ کو خیال آیا کہ چلو بھئی اپن نے نہیں پڑھے تو نہیں سہی — مگر چھوٹوں کو تو پڑھانا چاہئے تو یہ سب بچے میری ہی وجہ سے پڑھ رہے ہیں —" اور اس نے بڑے فخر سے شاہینہ کی طرف دیکھا — شاہینہ کا دل اندر سے بری طرح چکنا چور ہو رہا تھا۔ مگر وہ اعجاز کا دل رکھنے کو مسکرا کر بولی —

"آپ نے واقعی بہت اچھا کام کیا —"

اچانک اعجاز بڑے پیار سے پوچھ بیٹھا — "شاہینہ تم جو خود ایک اتنی پڑھی لکھی لڑکی ہو تو تمہیں یہ خیال نہیں آتا — کہ میرا دولہا کتنا جاہل ہے"؟

اعجاز نے کیسے اس کے دل کا چور پکڑ لیا!! وہ گھبرا سی گئی — مگر جیسے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی —

"پتہ نہیں آپ بھی کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا دنیا میں تعلیم ہی سب کچھ ہے — اور وہ بات بنا کر بولی "اور کیا آپ چاہیں تو تعلیم حاصل نہیں کر سکتے"

کچھ خجالت سے اعجاز بولا — "اب پڑھوں گا تو کتنی شرم نہیں آئے گی"؟

"میں پڑھاؤں گی —" شاہینہ ایک عزم کے ساتھ بولی۔

"مجھ سے تو آپ کو شرم نہیں آئے گی نا —" اس کے لہجے میں اچانک پیار امڈ آیا تھا۔

شادی کو ابھی صرف ایک ہی ماہ ہوا تھا اور ابھی تک دعوتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اعجاز چن چن کر ایسے بے تکے لباس پہنتا کہ شاہینہ اپنے

آپ میں کٹ کٹ جاتی ۔ مگر منہ سے کبھی کچھ نہ بولتی ۔

اس دن شاہینہ کی کالج کی تمام سہیلیوں نے دونوں دولہا دلہن کو مدعو کیا تھا۔ پارٹی عائشہ کے بنگلے پر ہونی ٹھہری ۔۔ عائشہ کے ڈیڈی میڈیکل کالج کے ہیڈ تھے ۔۔ بڑی دھوم دھڑکے کی پارٹی تھی ۔ شاہینہ کا دل رہ رہ کر ڈوب رہا تھا۔ اس کی سہیلیاں کیا سوچیں گی۔ کیسی دل ہی دل میں ہنسی اڑائیں گی ۔۔ اللہ کرے آج اعجاز ذرا سلیقے کے بن جائیں۔ اعجاز تیار ہو کر نکلا تو وہ سہم سی گئی ۔

اعجاز نے کالے رنگ کی پتلون پر نیلے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا اور سرخ رنگ کی چینختی ہوئی سی ٹائی باندھ رکھی تھی ۔ پتہ نہیں کہاں سے برآمد کئے ہوئے پیلے رنگ کے جوتے پہنے تھے اور بالوں میں اتنا تیل چپڑ رکھا تھا کہ لگتا تھا کہ تیل میں ڈوب کر نکلا ہو ۔ آتے ہی اس نے بڑے بھولپن سے پوچھا ۔

"کیوں شاہینہ کیسا لگ رہا ہوں ۔"

"بہت اچھے ۔" شاہینہ بمشکل حلق تر کرتی ہوئی بولی ۔ لیکن یوں جیسے کوئی بچے کو بہلائے ۔۔ بڑے پیار اور ملائمیت سے ۔ اگر آپ پورا سوٹ ایک ہی رنگ کا پہنتے تو زیادہ جچتے ۔

"ارے نہیں شاہینہ ۔ وہ بیحد خوشدلی سے بولا ۔

"میں نے آج خاص طور سے یہ کپڑے چنے ہیں کیونکہ تمہاری سہیلیوں کے ہاں جو جانا ہے ۔"

"جیسی آپ کی مرضی ۔" شاہینہ پیار سے بولی

"اور آج تمہیں بھی میری پسند کے کپڑے پہننے ہوں گے۔" کہتا ہوا اعجاز الماری کی طرف بڑھا۔

کپڑوں کی حد تک تو خیر غنیمت تھا کیوں کہ جیسی ساڑی اس نے چُنی اسی کی میچنگ کا بلاوز ساتھ ہی رکھا ہوا تھا جو اُسے نکالنا ہی پڑا۔ لیکن نارنجی رنگ کی ساڑی پر اس نے گہرے کتھئی رنگ کی لپ اسٹک شاہینہ کے لئے چُنی۔ حالانکہ اس کے پاس بالکل نارنجی شیڈ کی بڑی پیاری ہلکی سی چمک والی لپ اسٹک موجود تھی۔ غضب تو جب ہوا کہ آدھا زیور اس نے سونے کا نکالا۔ آدھا موتیوں کا۔ انگوٹھی فیروزے کی۔ تو بریسلٹ پکھراج کے۔ نارنجی جوڑوں پر اس نے جنے کہاں سے اودے رنگ کی سینڈل کھوج نکالی۔

شاہینہ پریشان ہو گئی۔ کالج بھر میں اس کی نفاست پسندی اور سلیقے کی دھوم تھی۔ اس کی میچنگ کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی ساڑی سفید پہنتی تو لپ اسٹک سے لے کر چوڑیاں، انگوٹھی، چپل، زیور تک سفید ہی پہنتی۔ مناسبت کے لئے چاندی کے زیور کو ترجیح دیتی۔ اور آج اس کی ساری سہیلیاں جمع ہونے والی تھیں۔ وہ کیا سوچیں گی کہ یہ شاہینہ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیسے کیسے مذاق نہیں اڑائیں گی۔ اور پھر جب دونوں کی جوڑی ساتھ ساتھ لمبی گاڑی سے اترے گی تو کیسے چوں چوں کا مربّہ وہ دونوں نظر آئیں گے ــــ؟ کیسا پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔؟ لیکن اس نے بڑے ضبط اور خوش دلی کے مظاہرے کے ساتھ کپڑے زیور سمیٹے اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئی تو بالکل دیوالی

کی ہنڈ کلہیا لگ رہی تھی۔ کوئی رنگ ایسا نہ تھا جو چھوٹ گیا ہو۔ ہر رنگ نے انصاف کیا تھا اور اس کے جسم پر موجود تھا۔ آئینے میں اس نے خود کو دیکھا۔ صورت تو بیحد پیاری لگ رہی تھی۔ گہرے کھتئی رنگ کی لپ اسٹک کے باوجود! مگر پورا حلیہ! اعجاز نے اسے بڑی خوبصورت نگاہوں سے دیکھا۔ اور جیسے سرشار ہو کر بولا۔

"اُف — میرے ذہن میں بالکل ایسی ہی دلہن کا تصوّر تھا!"

شاہینہ مسکرادی اور جواباً بولی — "میں نے بھی اپنے ذہن میں ایک روائتی شہزادے کا تصوّر سجا رکھا تھا وہ بالکل آپ جیسا تھا۔"

اچانک گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے اعجاز نے اناڑی پن سے پوچھا۔

"مگر شاہینہ مجھے یہ تو بتاؤ، چلو کہ میں تمہاری سہیلیوں سے بات کیا کروں گا۔؟"

شاہینہ ہنسی — "ارے کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ جو وہ پوچھیں آپ جواب دیجئے گا — آپ کی تعریف کریں تو تھینک یو یا شکریہ کہیئے گا۔"

"اور سوری کب بولوں۔؟" اس نے بچے کی سی ادا سے پوچھا

شاہینہ کا جی چاہا، چیخ چیخ کر رو پڑے — لیکن ابا میاں کے الفاظ ذہن میں گونج اٹھے — "کبھی اپنے والدین کا سر دنیا کے سامنے نیچا نہ ہونے دینا عورت ہی گھر کو جنّت بناتی ہے۔ عورت ہی دوزخ — تم خود جنّت کا ایک روپ ہو —"

"نہیں نہیں —" اس نے اپنے آپ کو سنایا۔ "میں اپنی گھریلو

زندگی کو تباہ نہیں ہونے دوں گی ــ کیا ہوا اگر وہ جاہل ہیں ـ میں انھیں سنوار لوں گی ـ اور وہ جیسے آپے میں آکر بولی ـ

"سوری آپ اس وقت بولیں گے، جب میری کوئی فرینڈ آپ کی طرف کوئی چیز بڑھائے ـ اور آپ لینا نہ چاہیں ـ یا آپ کا پیر اتفاقاً کسی کو لگ جائے ـ ـ یا ـ ـ ـ" اور وہ بچوں کے سے انہماک سے سنتا رہا ـ

واپسی میں راستہ بھر دونوں خاموش رہے ـ اعجاز کی خاموشی میں شرمندگی کا پہلو تھا ـ اور شاہینہ کی خاموشی یوں تھی کہ بات کرکے مزید شرمندگی کا موقع اعجاز کو نہیں دینا چاہتی تھی ـ

بات کچھ بھی نہیں تھی ــ وہاں پارٹی میں بیٹھے بٹھائے اعجاز نے شاہینہ کی ایک سہیلی کے ٹھوکر ماردی اور پھر بڑے خلوص کے ساتھ کہا ـ

"تھینک یو ـ"

اور جب سہیلی نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بڑے بھولپن سے پوچھ رہا تھا ـ "کیوں شاہینہ میں نے تھینک یو ٹھیک ہی کہا نا ـ"

اس دن جب دونوں سٹی مارکٹ سے شاپنگ کرکے لوٹ رہے تھے تو راستے میں ایک جگہ شاہینہ نے اسے کار رکوانے کو کہا ـ اعجاز کو اکیلا چھوڑ وہ خود ہی ایک دکان میں گئی اور تھوڑی دیر میں ایک بنڈل لے آئی ـ

"اب چلئے ــ" وہ بڑی خوشی سے بولی ـ

"یہ کیا ہے ــ" اعجاز تجسس کو نہ روک سکا ـ

"آپ کے لئے ایک تحفہ ـ" وہ ہنس دی ـ

"میں دیکھوں ؟"

"اونہوں ــ" وہ پیار سے بولی ــ "گھر چل کر ــ"

کمرے میں پہنچتے ہی اعجاز نے سب سے پہلے بنڈل کھول کر دیکھا ــ کتابیں ــ! انگلش کی ــ!

"مگر میں یہ پڑھ نہیں سکتا شاہینہ ــ میرے لئے کوئی اور تحفہ لاتیں ــ"

"اسی لئے تو لائی ہوں جناب کہ آپ پڑھ نہیں سکتے۔ میں خود آپ کو پڑھنا سکھاؤں گی ــ"

تو گویا آپ میری استاد بنیں گی ــ"

"جو بھی آپ کہہ لیجئے ــ" پھر وہ بیحد پیار سے بولی ــ

"اجی آپ جیسے بھی ہیں میرے ہیں ــ میں جیسی بھی ہوں آپ کی ہوں ــ اگر ہم دونوں اپنی خامیاں ایک دوسرے کی مدد سے دور کر سکتے ہیں تو اس میں شرم کیسی ــ؟"

اعجاز اس کی اس قدر بے پناہ محبّت سے یوں پگھل کر رہ گیا جیسے آگ کے سامنے گھی ــ

زندگی سراسر ایک کڑا امتحان تھی مگر اب شاہینہ کو اس امتحان میں بھی ایک لذت محسوس ہونے لگی تھی ــ سارے مہرے ایک ایک کر کے اس کی گرفت میں آتے جا رہے تھے ــ اس کی زندگی کا مقصد صرف ایک ہی تھا ــ اعجاز سنور جائے ــ کوئی نہ سوچے کہ تعلیم یافتہ بیوی نے جاہل شوہر کو ٹھکرا دیا ــ کوئی یہ سوچے کہ مرد جاہل تھا تو بیوی نے اسے گناہی نہیں نہ عزت دی نہ محبّت ــ وہ تعلیم کو کیوں بدنام کرے ــ وہ نئے دور کی پروردہ

ضرور تھی ۔ وہ بے پردہ تھی ۔ پارٹیوں میں جاتی تھی ۔ پکچر دیکھتی تھی ۔ غیر مردوں سے بھی ملتی تھی ۔ میک اپ کرتی تھی ۔ لپ اسٹک لگاتی تھی سب کچھ کرتی تھی ۔ لیکن وہ ان عورتوں میں سے تھی ۔ جو باغ میں جاتے ہیں تو پھول سمیٹ لیتے ہیں ۔ کانٹوں کو چھوڑ دیتے ہیں ۔ یا کانٹے چبھ بھی جائیں تو ان کی چبھن کی برداشت کا مادہ بھی رکھتے ہیں ۔ آج کتنے دنوں سے وہ کانٹوں کی چبھن برداشت کر رہی تھی ۔ مگر مونہہ سے اُف تک نہ کیا تھا ۔!!

اس دن جب شاہینہ نے اسے انگلش کی ابتدائی تعلیم ختم کروائی تو وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی ۔ اعجاز بھی بے حد خوش تھا ۔ وہ اپنے ازلی بھولپن کے ساتھ بولا ۔

" کیوں نہ اس خوشی میں ہم ایک پارٹی دیں ۔۔ آں شاہینہ " ؟

شاہینہ سہم گئی ۔ پارٹی .... وہ بول نہ پائی لوگ بھلا کیا سوچیں گے ۔ انگلش کی اتنی سی پہلی کتاب ختم ہونے پر پارٹی ۔ پھر ایک اور ندامت کا سامنا ۔ مگر وہ بر وقت سنبھل گئی ۔

" اجیّ ۔ میں نے آپ کی کوئی بات کبھی ٹالی ۔ " مگر ،

وہ پھر کر شرمائی ...... اور کچھ کسل مندی کے ساتھ بولی ۔

" اتنی بڑی پارٹی کا انتظام میں نہ کر پاؤں گی ۔ "

" کیوں بھلا ۔ " اعجاز حیرت سے بولا

" افوہ ۔ آپ کو تو ہر بات کھول کر سمجھانی پڑتی ہے ۔ " اور اس نے اجیّ کے سینے میں اپنا منہ چھپالیا ۔

"اچھا یہ بات ہے۔ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔" مگر جانِ جاں آج ایک آخری فرمائش ..... اس پارٹی کے بعد سارے ہنگامے بند۔ جب تک کہ تم اور میں ماں اور باپ نہیں بن جاتے۔ شاہینہ نے لپک کر اس کا منہ بند کر دیا۔" خدا نہ کرے جو آپ آخری فرمائش کریں ... خدا کرے آپ ہمیشہ زندہ رہیں۔ اور نت نئی روز ایک سے ایک فرمائش کریں۔ میں جو ہوں آپ کی فرمائشیں پوری کرنے والی۔ آپ کے ناز اٹھانے والی۔"

رات گئے تک دونوں میاں بیوی نے مل کر خوب لمبی چوڑی لسٹ بنا ڈالی، کون کون آئے گا۔ کون کون نہیں۔ کیا پکے گا، کیا پروگرام رہے گا۔

"کھانے کے بعد قوالی رہے تو کیسا رہے۔؟ اعجاز بڑی ترنگ میں تھا۔

"یہ تو خالص بزنس والوں کے چونچلے ہیں۔ رکھوا لیجئے جیسی آپ کی مرضی۔" وہ ہنسی۔

اعجاز مسکرایا۔" میری جان کبھی تو اپنی مرضی بھی چلا لیا کرو۔"

"اچھا تو کل آپ کپڑے میری مرضی سے پہنیں گے۔"

نو۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر فیصلہ کن انداز میں بولا۔" یہ کام مابدولت خود انجام دیں گے۔" اتنے دنوں کی پڑھائی کا چھوٹا سا خوش کن نتیجہ یہ تھا کہ اب اعجاز انگلش کے چھوٹے موٹے الفاظ گفتگو میں استعمال کر لیا کرتا تھا۔

اچانک اعجاز بولا۔" کل تمہیں اپنے سارے دوستوں سے ملاؤں گا۔ ملو گی۔؟"

شاہینہ کو اس پر ایک ساتھ ترس اور پیار آ گیا۔ جیسا کچھ بھی تھا، اس کا اچھا دل کا بُرا نہ تھا۔ ورنہ وہ شائد ہی نباہ کر پاتی۔ وہ کھلے دل سے ہنس کر بولی ۔ "ضرور ملوں گی ۔ آپ جو بھی کہیں کروں گی۔ جو بھی بولیں مانوں گی ۔ میں تو ہوں ہی آپ کی ۔

دوسرا دن بڑے صبر اور امتحان کا دن تھا ۔ ایک طرف اس کی اپنی ساری سہیلیاں اور ملنے جلنے والے ۔ دوسری طرف اعجاز کے سارے دوست احباب ۔ پتہ نہیں آج کی واردات کیا روپ دھارے ۔
کوئی بات نہیں ۔" وہ جیسے اپنے آپ کو سمجھاتی ہوئی بولی ۔ "جس طرح یہ سات مہینے نکل گئے ہیں ۔ یہ گھڑی بھی ٹل جائے گی ۔"۔ مگر دعوت کی نوعیت کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ دہلی جا رہی تھی ۔ سوچنے والے کیا سوچیں گے ۔ ابتدائی کتاب پوری کرنے پر اتنا بڑا ہنگامہ! پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔
"ویسے ہے تو واقعی خوشی کی بات نا ۔ بہر حال ایک انسان نے ترقی کی طرف اپنا قدم تو اٹھایا ہے!"
شام پڑے اعجاز نے آ کر شاہینہ سے بڑے پیار سے کہا ۔
"آج ہم دونوں اپنی اپنی پسند کے کپڑے پہنیں گے ۔ تم بھی تیار ہو لو ۔ میں بھی ابھی آتا ہوں ۔' اور اس نے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا ۔ " بس جانِ من آج وہ سنگار کرو کہ سارے میں آگ لگ جائے۔"
شاہینہ ناز کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگ گئی ۔

چند منٹوں بعد جب شاہینہ تیّار ہو کر نکلی تو اعجاز بن سنور کر سامنے ہی کھڑا ہوا تھا۔ شاہینہ اسے دیکھ کر گرتے گرتے بچی۔

"آپ؟" اس کے منہ سے بس یہی لفظ نکلا۔

"آف کورس ہیں — کیوں میری جان کو اتنی حیرت کیوں ہے؟"

مگر شاہینہ واقعی اسے حیرت سے دیکھے گئی۔ ہمیشہ کی طرح، گنوار اور دیہاتی نظر آنے والا اعجاز آج کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا۔ ہمیشہ تیل میں چپڑے رہنے والے بال آج بھورے بھورے نظر آ رہے تھے۔ گرے کلر کا شاندار سوٹ — اس کے ساتھ میچنگ ٹائی۔ چوڑے پٹّے والی خوبصورت سی گھڑی، چمکدار جوتا۔ شاندار موزے —

اس نے بڑے دلکش انداز سے شاہینہ کا ہاتھ تھاما۔ بڑے ہی مہذّب اور شائستہ اسٹائل سے اس کو اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

"چلو جان — گیٹ پر کھڑے ہو کر ایک ساتھ اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کا استقبال کریں۔"

شاہینہ گم صم سی اس کے ساتھ ہولی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک دونوں ساتھ ساتھ کھڑے مہمانوں کو ریسیو کرتے رہے۔ اعجاز کا رکھ رکھاؤ کس قدر دل نشیں کیسا پیارا تھا۔ شاہینہ کو سب خواب سا لگ رہا تھا۔

جب اعجاز کے سارے دوست جمع ہو گئے اور کھانے کی گڑبڑ ہونے لگی۔ تو اعجاز نے ہاتھ اونچا کر کے سب کو مخاطب کیا —

"ایک منٹ —"

شاہینہ حیرت سے دیکھتی رہی۔

بڑے فصیح و بلیغ الفاظ، بڑے مہذّب اور شائستہ انداز میں اعجاز نے کہنا شروع کیا۔

"آج میں اپنے تمام دوستوں کے سامنے اپنی نیک فرشتہ خصلت اور فرماں بردار بیوی کو ایک طویل ین باس سے رہائی دلانے جا رہا ہوں۔ شادی سے پہلے ہی ایک دن میرے چند دوستوں کے ساتھ یہ بحث نکلی تھی کہ کوئی پڑھی لکھی لڑکی۔ خاص طور سے آج کل کے زمانے کی لڑکی۔ کسی جاہل کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی۔ مجبوری ناطے، یا اس کی دولت ناطے کبھی بے تدبر مزاجی، جھگڑے اور گھریلو تلخیاں پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں۔ ایک ایسی لڑکی، جس نے اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں نہ کبھی سنا ہو۔ نہ اسے دیکھا ہو۔ اور جب سنے تو یوں اور دیکھے تو یوں کہ سوائے شرمندگی اور ندامت کے کچھ نہ ملے۔ کوئی سوچ سکتا ہے اس کے احساسات کیا ہو سکتے ہیں۔؟ مگر میرا یہ ایمان رہا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، مشرقی لڑکی لاکھ پڑھ لکھ لے۔ نوکری کرے بے پردگی کرے۔ کچھ بھی کرے اس کی فطرت میں اللہ نے جو سادگی اور اور مٹھاس رکھ دی ہے۔ اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ جب ہماری یہ بحث نکلی تھی میں اکیلا ایک طرف تھا۔ میرے سارے دوستوں کی پلٹن ایک طرف۔ میں نے ان سب کو یہ چیلنج کیا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے ترس آتا ہے کہ دلہناپے کے شروع شروع کے ارمانوں آرزؤں کے دن تو بیچاری دلہن کے محض آزمائش اور امتحان ہی میں کٹ گئے، لیکن مجھے خوشی یہ ہے کہ

میرا سر نیچا نہیں ہوا۔ حد یہ ہے کہ شاہینہ نے اپنے میکے خط لکھنا تک چھوڑ دیے۔ مبادا دل کی دکھن کسی تحریر میں ظاہر ہو جائے۔ شاہینہ ایک ایسی لڑکی ہے جو زندگی بھر دکھ اُٹھا کر بھی مسکراتی رہتی۔ میرا یہ چیلنج تھا کہ سال بھر تک میں طرح طرح سے شاہینہ کو آزماؤں گا۔ لیکن پیارے دوستو اب جبکہ ہماری بگیا میں بہار پوری طرح چھانے جا رہی ہے۔ میں شاہینہ کو، اپنے ہونے والے بچے کو اور خود کو مزید دکھ نہیں دے سکتا ..... وہ رک کر ہنسا۔ ارے بھائی اس ساری مدّت میں میں نے بھی کوئی کم تکلیف نہیں اٹھائی ہے۔ ایک انگلش لٹریچر سے ایم، اے پاس شخص کی درگت آپ خود سوچ لیں جسے اے فار ایپل بی فار بے بی پڑھنا پڑے۔

اس نے مسکرا کر شاہینہ کی طرف دیکھا، مگر ..... وہ گھبرا گیا۔ تقریر ادھوری چھوڑ کر وہ لپکا۔ شاہینہ ہاتھوں میں مونہہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔ ...

وہ اسے تھام کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ "خدا کے لئے شاہینہ مری جان ....

"آپ نے ـــ آپ نے مجھے کتنا ستایا ہے کوئی اندازہ ہے۔

وہ مارے ندامت اور خجالت کے چکرا سا گیا۔ "ٹھیک ہے شاہینہ ـــ میں اپنی غلطی کو مانتا ہوں۔ لیکن شاہینہ میری فطرت میں جو منفیت ہے، وہ مجھے اُکساتی تھی کہ میں نیچا نہ پڑوں ـــ میں ان سالوں کو بتا دینا چاہتا تھا کہ مشرقی لڑکی مشرقی ہی ہوتی ہے ... اور تم

سو فیصدی جیتیں میری جان ـ ۔ ۔ ۔ ۔
" اور آپ یہ بھی بتانا چاہتے تھے نا کہ مجھ جیسی لڑکی آپ پچاس ہزار میں خرید سکتے ہیں ۔ ؟ وہ طعن سے بولی ۔
" پچاس ہزار ـــ ؟" وہ حیرت سے بولا " میں نے کب ایسی بات کی ـــ تم جیسی لڑکی پچاس ہزار تو کیا پچاس کروڑ میں بھی نہیں خریدی جا سکتی ـ "
پھر آپ نے مہر کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا ۔ ؟ کیا شادی کے ڈھکوسلوں میں مہر ایسا ہی ضروری ہے کیا سونا چاندی میری آپ کی محبت کا بدل ہو سکتا ہے ۔ ؟ وہ غصّہ سے بولی
" اُفوہ ـــ آج پتہ چلا میری رانی کو غصّہ بھی آسکتا ہے ـ "
اس نے شاہینہ کو اپنے سے قریب کر کے ہونٹ نزدیک لائے ۔ مگر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی ـ
" بے شرم کہیں کے ـ " میں آپ سے نہیں بولوں گی !
وہ بجھ سا گیا ـ " شاہینہ میری جان ـ کیا سچ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے ۔ ؟ "
وہ اس کے سینے سے لگ گئی ـــ " نہیں اجی نہیں ـــ آپ نہیں سمجھتے مجھے دکھ صرف ایک بات نے دیا تھا ـ آپ سوچئے ۔ جو لڑکی زندگی بھر کے لئے کسی کے ہاتھ اپنے آپ کو سونپ دیتی ہے اس کی ذات اور محبت کو پیسے کی ترازو میں تولنا کتنی عجیب بات ہے ـ کیا میں بکنے والی شے ہوں ۔ ؟ "

"افوہ" تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو جان ۔ میں نے کب ایسا سوچا ہے ۔ مگر چار لوگوں میں اپنی حیثیت کے رکھ رکھاؤ کی خاطر یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے ۔"

"تو وعدہ کیجیے کہ آپ مجھے وہ پچاس ہزار کی رقم کبھی نہیں دیں گے۔"

باہر سے شاہینہ کی سہیلیاں اور اعجاز کے دوست شور مچانے لگے

"ارے بھائی سہاگ رات بعد میں منا للینا ۔ یہاں بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے ۔ . . .

اعجاز نے پیار سے شاہینہ کو اپنی باہنوں میں بھر لیا۔ . . . دنیا بھر کی خوشیاں اس کی گرفت میں تھیں ۔ اسے یوں ہی تھامے ہوئے وہ دھیرے دھیرے باہر نکل آیا۔ جہاں ایک نئی شام ان دونوں کے انتظار میں جگمگا رہی تھی ۔

ماں

سہیلیوں نے میرے پور پور میں مہندی رچادی ۔ افشاں سے میری مانگ بھردی ۔ مجھے زیوروں سے لاددیا ۔ اور میں دلہن بن گئی ۔

باہر آنگن میں دھمادھم ڈھولک پٹ رہی تھی ۔ کنواری، بیاہی سبھی لڑکیاں پیا مَن کے گیت گا رہی تھیں ۔ یہ گیت میرے دل میں سورج کی کرنوں کی طرح چمک چمک کر اُترے جارہے تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خوش ہی نہیں تھی بے حد خوش تھی ۔ جب سنگھار پورا ہو گیا تو سہیلیوں میں سے کسی نے آواز دی ۔ "ارے بھئی کوئی جاکر باہر کہہ دے کہ دُلہن تیار ہو گئی ۔ جیسے رخ روشن کا دیدار کرنا ہے ۔ آجائے ۔۔"

سہیلی کی بات میں انوکھے پن کے ساتھ ایک چھیڑ بھی تھی ۔ میرا مونہہ مارے شرم اور خوشی کے تمتما گیا، جانے کتنی ہی عورتوں نے میرا بقول انھیں کے "چاند سا چہرہ" دیکھا ، بلائیں لیں ، دعائیں دیں اور کمرے سے نکل گئیں

سب سے آخر میں کمرے میں پیروں کی غمگین سی چاپ اُبھری، بوڑھی کلائیوں میں کھیلتی چوڑیوں نے ساز بجایا اور دھیرے سے میرا چہرہ دو سوکھے ہاتھوں نے اوپر کیا۔ میرا دم گھٹ کر رہ گیا۔ ارے یہ اماں ہیں۔!..

"اماں ۔ میری پیاری اماں!" میرے حلق سے کئی الفاظ پیار بن کر اُبھرنے کو ہوئے، مگر مجھے لگا کہ آنسوؤں کے آگے میں بالکل بے بس ہوں ۔ ایک ٹک میں انھیں دیکھتی ہی رہ گئی ۔ یہ اس قدر بوڑھی کیسے ہوگئیں۔ چہرے پر یہ غم کی چھاپ کیسی ہے۔ آنکھوں کے گرد یہ جھرّیوں کا جال اس قدر گہرا کس نے کر دیا۔؟ میرے دل سے ایک آواز اُبھری "یہ تم ہو، جسے پال پوس کر بڑا کیا۔ راتوں کو جاگ کر تمھیں سلایا۔ خود بھوکی رہ کر تمھارا پیٹ بھرا۔ اپنے آرام کو آرام نہ جانا، دکھ کو دکھ نہ سمجھا۔ پورے انیس برس انھوں نے ہر خوشی، ہر سانس، ہر احساس، کو تم پر نچھاور کیا ہے۔ اور آج تم ایک غیر کا گھر بسانے جا رہی ہو ۔ انھیں چھوڑ کر۔ کیا مائیں اسی دن کے لئے یہ کڑی مشقّت سہتی ہیں۔"

کسی کی آواز اُبھری، ۔ "روؤ نہیں بہن یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ لڑکیوں کو پالو اور غیروں کے حوالے کر دو..." کوئی اماں کو تسلی دے رہا تھا۔ مگر تسلی ایسی تھی کہ اس میں رونے کی تلقین تھی۔ اماں کی دبی، دبی، رکی رکی سسکیاں اب بغیر کسی جھجک کے اونچی ہونے لگیں۔ اور گھر ایک دم ماتم کدہ بن گیا۔ پایلن کے رنگین اور جھم جھماتے سپنے میری آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلے۔ میں بھول گئی کہ ابھی ابھی میرے دل میں صرف ایک ہی خواب جگمگا رہا تھا۔ میں بھول گئی کہ ابھی ابھی میں نے خوشی خوشی اس لئے سنگھار کرایا

تھا کہ کسی کی دنیا میں بہار بھر دوں۔ اب میں صرف یہ یاد کر کر کے سسک رہی تھی کہ میں ایک محبت بھرے بوڑھے دل کو توڑ کر جا رہی ہوں۔ اس اچانک احساس نے میرے دل کو مسوس کر رکھ دیا۔ کہ میں جو بھی قدم اٹھاؤں گی۔ وہ زمین پر نہیں بلکہ اماں کے دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں پر پڑے گا۔

اماں کی اُٹھائی ہوئی ہر کٹھنائی، ہر غم، ہر دکھ، ہر لمحہ جگنوؤں کی مانند چمکتا ہوا۔ میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے گزرنے لگا۔ میرا وجود میرے اپنے آنسوؤں میں بہنے لگا۔ اس لمحے وہ کانپتے ہوئے مگر مضبوط ہاتھوں نے میرا سر تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"روؤ مت میری بیٹی، میری گڑیا، اسی دن کے لئے تو میں جی رہی تھی کہ تمہیں اپنے گھر جاتے ہوئے دیکھوں۔ ایک ماں کی اس سے بڑی اور کیا آرزو ہو سکتی ہے کہ اولاد کا گھر بس جائے میں بہت خوش ہوں بیٹی ..... بہت خوش کہ تم اپنی سسرال جا رہی ہو۔"

الفاظ سسکیوں کے درمیان ٹوٹتے جا رہے تھے۔ مگر وہ میرے دل کی خاطر کہے جا رہی تھیں۔ تم یہ نہ سمجھو کہ تم سے میں چھوٹ گئی ہوں.... ماں بیٹی کا خون کا رشتہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ یہ گھر اب بھی تمہارا رہے گا جب چاہے چلی آیا کرنا۔"

وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ الفاظ میرے ذہن سے محو ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ آخر بار میں ان سے چیخ مار کر لپٹ گئی۔

"اماں میں آپ کے بنا نہ رہ سکوں گی۔ میں کہیں نہ جاؤں گی۔ مجھے اپنے پاس رہنے دیجئے اماں ... اماں ...."

سسرال آئے ہوئے مجھے پندرہ دن ہو چلے تھے۔ وقت کیسے کیسے گھاو مٹا دیتا ہے۔ ایک دن میں نے بیٹھ کر سوچا تو سخت حیرت محسوس ہوئی کہ وداع کے وقت میں کس طرح جگر پھاڑ کر روئی تھی مجھے یقین تھا کہ میں اماں کے بغیر ایک لمحہ بھی نہ گزار سکوں گی۔ ایک لمحہ تو کیا میں پندرہ دن گزار چکی تھی۔ اور کیا مجھے اماں کی یاد آئی تھی۔۔۔۔؟

میں نے اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کیا، حلق میں ایک گولہ سا آ پھنسا۔ میں نے اپنے دل کو بہلانا چاہا۔ مگر نہ بہلا۔ مجھے اداس دیکھ کر اس شام وہ مجھے سیر کرانے شہر سے دور لے گئے اور میں بھول گئی کہ میں کس درجہ غمگین تھی۔۔۔۔ باغ میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ منہ بند کلیاں جھوم رہی تھیں سارے میں مہک خوشیاں اور بہاریں بھری پڑی تھیں۔ ایسے لمحوں میں بھلا کون غم کا دکھڑا لے کر بیٹھتا ہے۔؟

پندرہ دن کے بعد اماں کا بڑا مختصر خط آیا۔ میری خیریت پوچھی تھی خط نہ لکھنے پہ ہلکا سا گلہ کیا تھا۔ کہیں بھی انھوں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ میری جدائی کو محسوس کر رہی ہیں۔ البتہ خط کے آخر میں وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔ وہاں ان کے صبر کا بھرم کھل گیا۔

" بیٹی خدا تمہیں خوش رکھے۔ انھوں نے خط کے آخر میں لکھا تھا۔" خدا تمہیں دونوں جہان میں شاد آباد رکھے۔" اپنی کیا لکھوں؟ بس یوں لگتا ہے کہ میری کوئی چیز کھو گئی ہے۔ دل کو مستقل بے کلی ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرو۔"

خط ہاتھ میں لئے میں کتنی ہی دیر بیٹھی رہی اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ کیا کروں ایک بار تو طے کر لیا کہ سب کو چھوڑ چھوڑ کر میکے چلی جاؤں۔ لیکن اسی لمحے یہ احساس ہوا کہ انیس برس کے مقابل میں پندرہ دلوں کا یہ بندھن کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہو رہا ہے۔ جانے کو مطلق جی نہ چاہا۔ مجھے خود پر غصہ آگیا کہ کیا اپنی ماں کو کوئی اتنی جلدی بھول جاتا ہے۔؟ میں خوب رونے لگی سسکیوں کی آواز سن کر وہ کمرے سے نکل آئے۔ میرے قریب آکر بولے۔

"ارے! تم رو رہی ہو..... کیا بات ہے؟ پھر میرے ہاتھوں میں آنسوؤں سے بھیگا خط دیکھ کر بولے۔" اچھا اماں کا خط آیا ہے۔ ارے تو اس میں رونے کی کیا بات ہے، چلو میں چھوڑ آؤں۔ آٹھ، دس دن بعد چلی آنا۔

"میرے موہنہ سے نہ "ہاں" نکلی نہ "نہ" انھوں نے خود ہی سامان باندھ دیا۔ اسٹیشن پہنچ کر جب انھوں نے ایک ہی ٹکٹ خریدا تو میرا کلیجہ موہنہ آگیا۔۔ "تو میں اکیلی ہی جا رہی ہوں۔"

میں نے پوچھنا چاہا۔ مگر شرم نے میرے موہنہ پر تالے ڈال دیئے..."

"نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ میں آپ کے بغیر ایک دن بھی نہ کاٹ سکوں گی۔" میں نے یہ سب چلا چلا کر کہا، مگر ایسی آواز سے، جو میرے ہونٹوں سے نہ نکل سکی۔ میرا من اندر ہی اندر رو رہا تھا کہ انھوں نے میرا سارا صبر لوٹ لیا۔

"اب ہمیں مہندی بھرے ہاتھوں سے کون مزے دار پان کھلایا کریگا؟"

دل ٹوٹنے کی آواز ہوا کرتی تو اس آواز سے شائد ساری دنیا کے کان پھوٹ جاتے، مگر افسوس یہی ہے کہ میرا دل اندر ہی اندر ٹوٹا اور کسی کو آواز تک نہ آئی میرے آنسوؤں نے میرا منہ دھویا... ٹرین دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔

جیسے میری طرح اس کا بھی جی آگے جانے کو نہ چاہ رہا ہو۔

میکے میں دن ایسے گزر رہے تھے، جیسے زندگی میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ زندگی کا دارومدار پوسٹ مین کی آواز پر رہ گیا تھا کسی کام کو جی نہ چاہتا۔ بات کرنے کو طبیعت نہ چاہتی۔ کھانے تک سے نفرت ہو گئی دل ہر لمحہ کہتا کہ پنکھ لگ جائیں اور میں اڑ جاؤں۔ ایک دن خالہ جان آئیں تو مجھ پر ایک سہانا انکشاف کر گئیں۔ "بیٹی یوں جی اداس کئے رہو گی، تو صحت کیا باقی رہے گی۔ تم تو بس میاں کی ہو کر رہ گئی ہو۔ بالکل ہی بدل گئیں کہ کبھی اس گھر کی ایک فرد تھیں۔" میں نے ہنس کر ٹالنا چاہا مگر وہ کہے گئیں۔ "اللہ رکھے چار دن کو جب ماں بنو گی تب پتہ چلے گا کہ اولاد کی دوری کیا غضب ڈھاتی ہے۔ بیٹی کو سدا بٹھا کر تو نہ رکھو گی۔ ذرا اپنی ماں کی طرف دیکھو کیسی ہو رہی ہیں ــــ؟"

میری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ خالہ جان کہنا کیا چاہتی ہیں ــــ؟ میرا کیا قصور کیا ہے ــــ؟ اماں کی اُداسی اور صحت کی خرابی میں میرا کیا ہاتھ ہے میں نے سوالیہ انداز سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ اب سسرال میں سدا ہی رہنا ہے۔ اب چند دنوں کے لئے میکے آئی ہو تو یہاں بھی خوش رہو۔ ورنہ تمہاری ماں کو کتنا دکھ ہو گا۔ کہ اتنے کم دن کے لئے آئی بھی تو اداس اداس ہی رہی۔"

میں نے شرمندگی سے اعتراف کیا: "کیا کروں خالہ جان طبیعت اس قدر سست ہو گئی ہے کہ کسی کام میں لگتی ہی نہیں۔"

وہ مسکرائیں۔ "پہلے پہل ماں بن رہی ہو نا، اس لئے ایسا ہو رہا ہے۔

ذرا خود کو سنبھالو ورنہ تمہارے میاں کو شکایت ہوگی کہ میری دلہن کو بیمار کر ڈالا"۔

زندگی نے جیسے بہار بن کر مجھے اپنی گود میں لے لیا تو میں ماں بن رہی ہوں!

میں نے بڑے غیر یقینی انداز سے سوچا، خوشی اور شرم اور فخر کے ملے جلے جذبات سے میرا دل بھر گیا۔ ایک دم خوف نے مجھے آن دبوچا "اور اگر بیٹی ہو گئی تو ــــ؟ ــ کیا وہ بھی مجھے اسی طرح چھوڑ کر چلی جائے گی۔ جس طرح میں نے اماں کو چھوڑا ہے۔ ... اور .. اور میں نے رکتے رکتے سوچا کیا وہ بھی مجھے اسی طرح بھول جائے گی، جس طرح میں نے اپنی ماں کو بھلا دیا ہے؟

دل کے چور نے مجھے جھوٹا دلاسا دیا "تم کب اپنی ماں کو بھولی ہو۔ یہ تو دنیا کی ریت ہے۔ ایسا تو ہوتا ہے ہے ایک کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے اس میں ڈر کی کون سی بات ہے"۔

چند روز میکے میں گزار کر میں سسرال چلی آئی۔ دن پر لگا کر اڑنے لگے ــ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ چوبیس گھنٹے لمبے یہی دن رات میکے میں کس قدر دیر میں گزرتے ہیں، مانو چوبیس سال میں چوبیس گھنٹے گزر رہے ہوں اور یہاں وہی چوبیس گھنٹے چوبیس لمحوں میں اُڑ جاتے ہیں۔ چمکیلے جگنوؤں کی طرح ــ اوروں کو تو کیا میں خود اپنے آپ ہی کو بھول گئی۔ اماں کے خط آتے رہے ــ جس دن خط آتا، بس چند لمحوں کے لئے دل میں چبھن سی ہو جاتی۔ کہ ایک بوڑھا دم ہے جو مجھے جی جان سے یاد کئے جا رہا ہے اور میں کس منزل کی آس میں گم ہوں۔! گھبرا گھبرا کر دل میں یہی دعائیں مانگنے لگتی کہ خدایا مجھے ایک بیٹے کی ماں بنانا۔ مجھے لڑکی نہیں چاہیئے۔ جو مجھے چھوڑ کر چلی جائے۔ اور یوں بھول جائے، مجھے بیٹا چاہیئے۔ جو سدا

میرا ساتھ دے ۔ میں کسی کی جدائی کو برداشت نہ کر پاؤں گی۔

چند ماہ گزرنے پر اماں نے مجھے پھر بلایا اس بار وہ میرے ساتھ تھے مجھے ان کی قربت کا، ان کا ساتھ ہی چاہیئے تھا۔ اب بھلا میں کیوں غمگین رہتی ۔۔ اماں نے میری دیکھ ریکھ میں کوئی کسر باقی نہ رکھی ۔ شہر کی سب سے قابل اور ماہر لیڈی ڈاکٹر کے پاس میرا کیس دیا گیا۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، سوتے، جاگتے جیسے اماں مجھے نہارتی رہتیں اور یہ دعا جیسے ان کی زندگی کا جزبن کر رہ گئی تھی ۔ "خدا ساتھ خیریت کے بیٹا دے۔"

شاید وہ بھی اس کہانی کو دہراتے نہیں دیکھنا چاہتی ہوں گی کہ ایک بیٹی نے خوشیوں میں اپنی ماں کو بھلا دیا ہے۔

چند دن اور گزرے ۔ پھر ایک دن مجھے اسپتال لے جایا گیا۔ وہ دروازے کے باہر بے چین کھڑے تھے ۔ اماں میرے سرہانے کھڑی دعائیں مانگ رہی تھیں جانے کتنی صدیاں کشمکش میں گزریں کہ ایک ننھی سی چیخ نے میرے قدموں تلے جنت کی تعمیر کا مژدہ سنایا۔ اماں لپکیں ۔ لیڈی ڈاکٹر نے ہنس کر اعلان کیا "ننھی منی پیاری لڑکی مبارک ۔"

"اماں نے مجھے پلٹ کر دیکھا ۔ انجانے خوف نے مجھے آدبوچا۔ یہاں جو آج اس طرح بے بس ہو کر میرے سامنے کھڑی ہے ۔ جس نے اپنی خوشیاں اپنا آرام، اپنی زندگی تک میرے لئے تج دی، یہ میں ہی ہوں ۔ وقت اسی طرح ایک بار پھر اس کہانی کو دہرائے گا۔ کیا آنے والے ماہ و سال اسی طرح میری زندگی کا رس نچوڑ لیں گے۔ ؟ کیا کیا ... میں نے رکتے رکتے سوچا ... کیا میری بیٹی بھی میرے نقش قدم پر چلے گی ؟ میرے دل سے آنسوؤں کا

ایک بادل اٹھا..... آنسو میری آنکھوں میں لپکنے کو بے قرار ہوئے ہی تھے کہ ایک دم نرس نے بچی کو میرے بازو پر لٹا دیا۔ میں نے اس کی موہنی صورت دیکھی۔ اور جانے کیوں دھڑکتے دھڑکتے ہوئے دل کو قرار سا آگیا۔ ارے یہ کون رونے دھونے کی بات ہے۔ یہ تو دنیا کی ریت ہے اور میں نے بے حد مطمئن ہو کر ننھی سی جان کو اپنے کلیجے سے چمٹا لیا۔

محبّت

"بیٹا گل بانو ــــ ذرا چائے کی پیالی تو دینا مجھے ــ"

اور گل بانو چائے کی پیالی تھام کر یوں بل کھاتی، چکراتی اٹھی مانو انسان نہ ہو دھواں ہو ــ دھواں بھی شائد اس قدر بل نہیں کھاتا ــ اماں نے لرز کر سوچا ــــ اور جب گل بانو چائے کی پیالی رکھ کر چلی گئی تو اکدم اماں نے ایسا محسوس کیا جیسے ان کی آنکھوں میں واقعی دھواں بھر گیا ہو ــ اور آنکھیں بھر سی گئی ہوں ــــ انھوں نے پھر سے گل بانو کی طرف دیکھا جو لچکتی مہکتی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی ــــ ساڑی میں اس کا جسم کسا کسا لگ رہا تھا ــ اور بلاوز کیسے پھنس کر رہ گیا تھا ــ اور کمر ــ؟ کمر تو اس قدر پتلی تھی کہ اگر کوئی کوشش کرتا تو کلائی کی چوڑی اس کی کمر میں پہنا دی جا

سکتی تھی — جو بھی کپڑا پہن لیتی یوں لگتا جیسے اب پھٹ کر ہی اتریگا۔ جوانی تو سبھی پہ آتی ہے۔ مگر گل بانو پر جوانی یوں آئی کہ لگتا تھا اس کا جسم اپنی مار سے آپ ہی تڑخ جائے گا۔ پھٹ جائے گا۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ گل بانو کا جسم خطرناک حد تک خوبصورت تھا اتنا خوبصورت کہ کوئی تشبیہ بھی نہ دی جا سکتی تھی۔ چار بھائیوں کے بعد پیدا ہونے والی بہن — ایسا بڑھتا ہوا جسم لے کر آئی تھی کہ بڑے چاروں بھائی تو وہیں کے وہیں چھواروں کی طرح چرمرا کر رہ گئے تھے۔ اور یہ چھوارے کے پیڑ کی طرح بس بڑھتی ہی چلی گئی۔ اور جب ایک حد پر آ کر رکی تو یوں رُکی کہ سراپا خطرہ بن گئی — جہاں خطرہ ہو لوگ اس کے آس پاس سرخ نشان لگا دیا کرتے ہیں — یہ بذات خود سرخ نشان تھی۔ خطرے کی علامت۔ گل بانو کی صورت جو ایک بار دیکھ لیتا شائد بھول نہ پاتا۔ لیکن صورت کے ساتھ کبھی جسم بھی دیکھ لیتا تو صورت بھول جاتا — مٹ جاتا۔ بیضوی چہرہ — چمپئی رنگت۔ کٹی کٹی آنکھیں۔ جیسے کسی نے کھٹی کیری کی قاشیں کاٹ کر سجا دی ہوں۔ ناک ایسی تیکھی اور کھڑی کہ ذرا نتھنے اُٹھا کر "شوں" کر دے تو ساری دنیا جل کر بھسم ہو جائے۔ بال ایسے گھنیرے کہ نہا کر جب بال پیٹھ پہ چھوڑ دیتی تو وہ آس پاس اِدھر اُدھر۔ آگے پیچھے یوں جھول جاتے جیسے سیاہ فر کا کوٹ پہن رکھا ہو۔ مگر بڑے تعجب کی بات تھی کہ جسم ایسا خطرناک ہتھیار — اور حسن ایسی دو دھار تلوار ہوتے ہوئے بھی وہ اب تک کنواری تھی — ۱۹ تو کبھی کے بھر چکے تھے اور کوئی دلہا تا کہ وہ بیس کی ہو جاتی — بیس چھوڑ پچیس کی بھی ہو جاتی تو کوئی بات نہ تھی بشرطیکہ وہ بھائیوں جیسی

چھوارا ہوتی ۔ یہاں تو وہ عالم تھا کہ جیسے ندی نے سارے بند باندھ توڑ دیئے تھے ۔ اور بس بہی چلی جارہی تھی ۔ اماں ہول ہول کر اسے دیکھتیں۔

" موا ہندستان کیا تقسیم ہوا کہ سارے لڑکے اڑن چھو ہو گئے ۔ اب تو دوا ناطہ گھس کر لگانے کو بھی نہ ملے ہیں ۔ اب تو تعلیم چاہیے کہ نوکر یاں کروائیں ۔ پیسہ چاہیئے کہ بزنس شروع کر دیں ۔ خالی خولی صورت کو کون چاٹتا ہے ۔"

اور واقعہ بھی یہی تھا کہ گل بانو کے جسم کا مول لگانے والے ، اس کی خوبصورتی کو تک کنے والے جتنے کچھ بھی تھے ۔ سب شادی شدہ تھے جو ایک ہی بدمزہ ہانڈی کھاتے کھاتے بور ہو چکے تھے ۔ ایسے میں چٹ پٹا شامی کباب دیکھ کر منہ میں پانی آنے ہی والا تھا ۔ مگر بی اماں اپنی بٹیا کو ایسے دانتوں تلے جھونکنے پر راضی نہ تھیں جو آگے ہی بھنے کلیجے کھا چکے ہوں ۔'

مگر خدا نے جسے بھی اتارا ہے جوڑے کے ساتھ اتارا ہے ۔ کیا پرند ۔ کیا پرند ۔ کیا جانور ۔ کیا حیوان ۔ کیا انسان ۔ جو بھی اس دنیا میں نر بن کر آیا ہے اپنی مادہ ساتھ لایا ہے ۔ تو پھر گل بانو ہی کیوں کنواری رہ جاتی ، ؟

محلے میں نئے کرایہ دار آکر اترے تھے ۔ ایک بڑی بی تھیں ایک بیٹیا اور بس اللہ اللہ خیر سلا ۔ لڑکا بیدھا سادہ تھا ۔ سائیکل پر سر جھکائے یوں پیڈل مارتا چلا جاتا مانو تلاوت ہو رہی ہو ۔ جھوم جھوم کر ۔ نگاہیں نیچی کئے ۔ سر جھکا ہوا ۔ کئی دفعہ بسوں موٹروں سے ٹکراتے ٹکراتے

بچا، — ماں اس سے بھی زیادہ سیدھی تھیں کہ پہلی بار جب بیٹا شہر لایا اور نئے بجلی ریڈیو سے آراستہ مکان میں اُتارا تو ریڈیو کو دیکھ دیکھ کر گھنٹوں اچنبھے میں رہتیں اور بھولے منہ سے پوچھتیں۔

" ائی بیٹا اِتّے سے ڈبّے میں آخر اتّے آدمی کیسے بیٹھ پاتے ہوں گے"

گلُ بانو کے یہاں ان کا آنا جانا یوں شروع ہوا کہ بڑے بھیّا جو پردیس میں نوکری پر چڑھے ہوئے تھے واپس چھٹی پر لوٹے تو اپنے ساتھ ڈھیر ساری مٹھائیاں اور تحفے لائے — امّاں نے محلّہ کے ہر گھر میں کچھ تو ریت ناطے اور زیادہ فخر کے ناطے حِصّے لگا لگا کر بھیجے — نئے کرایہ داروں کے ہاں سے تھالی خالی واپس نہ آئی — تھالی میں ہرے پان اور چکنی ڈلیاں بھی رکھی ہوئی تھیں کہ یہ خوشیوں کا شگون ہوتا ہے کہ تھالی خالی واپس نہ جائے اور اس پر بس نہ ہوئی تو رات کو برقع اوڑھ کر خود بڑی بی مبارکباد دینے چلی آئیں۔

آئیں تو مبارکباد دینے مگر دے بیٹھیں دل۔ گل بانو بڑے بھیا کی لائی ہوئی سبز رنگ کی ساری پہنے پورے گھر میں اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ چال میں اس بلا کی لچک تھی کہ بڑی بی نے سوچا اگر ایک ناگن اور ایک گل بانو کو ساتھ ساتھ چھوڑ دیا جائے۔ تو نامراد ناگن تو وہیں چپکی رہ جائے اور یہ سِل سِل کرتی آگے ہی بڑھتی جائے۔ پھر تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ — آگا نہ پیچھا۔ بیٹے کی مرضی پوچھنے کا بھی کون تک تھا — ؟ کیا مائیں اسی دن کے لئے اولاد پیدا کرتی ہیں کہ ان کی اچھائی بھی کرنی ہو تو انھیں سے پوچھ پاچھ کر کرو — ؟۔ ماں ہونے کے ناطے کچھ ان کا حق بھی تو تھا نا — ؟

ادھر اُدھر کی غیر ضروری باتوں کے بعد انھوں نے پوچھ ہی ڈالا —

"اے بہن، میں پوچھوں ہوں کہ کیا بٹیا کہیں منگی ہوئی ہیں۔"

ہوشیار بیوپاری وہی ہے۔ جو دس سال پرانی چیز کو بھی گاہک کے روپے پر یوں پیش کرے جیسے ابھی ابھی پارسل کھلا ہو۔ انھوں نے دل ہی دل میں خوشی سے بے حال ہو کر مگر لبظاہر بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"اب بہن اپنے منہ سے کیا کہوں ۔ بٹیا کی صورت ہی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ایسی صورت پر کون نہ مرمٹے۔"

ایک ماں کے منہ سے اپنی بیٹی کے لئے اس قسم کے الفاظ بڑی بی کو کچھ بھلے نہ لگے۔ مگر وہ تو گل بانو پر سچ مچ ہی مرمٹ گئی تھیں۔ گھبرا کر بولیں۔ "کس خوش نصیب کے نصیب جاگے ہیں۔"

اماں لاپروائی سے بولیں۔ "ابھی تو میں نے کسی کو جواب نہیں دیا ہے۔ مگر اسی برسات کے بعد بیاہ دینے کا ارادہ ہے۔ ایک ہی تو بیٹی ہے جتنے بھی دن مجھے اس کی محبت اس کا ساتھ مل جائے۔ مل جائے۔"

بڑی بی نے اکدم ساسوں والی گفتگو شروع کردی۔ "اے بہن آخر ایک نہ ایک دن تو بیٹیوں کو وداع کرنا ہی ہوتا ہے۔ بادشاہوں نے بیٹیاں بٹھائیں نہ پیغمبروں نے۔ ہم آپ کس شمار قطار میں ہیں۔" پھر وہ ذرا آگے کو کھسکیں۔ اور شہد میں چپڑے ہوئے لہجے سے بولیں۔

"میرا بیٹا سراج تو یہیں ہزار بار سڑک پر آتا جاتا ہے۔ بھائی صاحب نے تو دیکھا ہوگا۔ تین سو روپے ماہوار کماتا ہے۔ گھر میں بجلی ہے۔ ریڈیو ہے۔ گرم استری ہے۔ (ان کا مطلب سراسر بجلی کی استری سے تھا) اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اب حکومت اسے موٹے پہیوں والی سائیکل کے لئے

تین ہزار روپیہ قرض بھی دینے والی ہے۔ اب آگے میں آپ سے کیا کہوں بہن۔"

مگر اماں تو آگے بہت کچھ سننا چاہتی تھیں، اپنے دلی جذبات کو دباتی ہوئی ۔ پان پر چھپا چھپ چونا کتھا تھوپتی ہوئی بولیں ۔" بہن صاحبہ معاف کیجئے گا ۔ میں آپ کا مطلب تو اب بھی نہ سمجھی ۔"، بڑی بی نے ایک نظر گل بانو کو دالان میں سے بل کھاتے، گذرتے دیکھا ۔ پھر جلدی جلدی بولنے لگیں ۔

"اوئی بہن ۔ کہنا سننا کیا ہے ۔ یہ چاند اب آپ کے آنگن میں روشنی نہ لٹائے ۔ میرے آنگن میں چاندنی بکھیرے تو زیادہ خوبصورت لگے ۔" اُنھوں نے دونوں ہاتھوں سے اماں کے ہاتھ تھام لئے ۔

"پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہوں ہوں بہن ۔ ابھی جب آپ نے بٹیا کو گل کہہ کر پکارا تو مجھے لگا کہ جس گھر میں ایسا پھول مہکے اسے کون سے باغ بغیچوں کی ضرورت ہے ۔" بہن "۔ وہ گھگھیائیں ۔" اللہ جانتا ہے ۔ بٹیا بیٹی کے معاملے میں صرف محبت کو دیکھنا چاہیئے ۔ اور میں اتنا یقین دلاتی ہوں کو بٹیا کو ہمارے گھر سے بھر پور محبت ملے گی ۔"

گل بانو اپنی جسامت کے لحاظ سے لاکھ ماں باپ پر بھاری ہو مگر واقعہ یہ تھا کہ ابھی وہ زندگی کے اس دور میں ہرگز نہیں آئی تھی کہ خود اس کا وجود اپنے آپ پر بھاری ہو جاتا ۔ وہ تو ابھی میکے میں یوں خوش خوش اچھلتی پھرتی تھی جوں چنچل ہرنیا ہرے بھرے بن میں بلا کسی کھٹکے اڑتی پھرتی ہے ابھی تو اسے پتہ بھی نہ چلا تھا کہ بیٹی کا بوجھ ماں باپ کو کیسے دہرا کر دیتا ہے ۔ اس نے تو یہ بھی نہ جانا تھا کہ اپنی ہی کوکھ سے پیدا کی گئی اولاد کسی لمحہ ماں کی آنکھ میں

سوئی بن کر کھٹکنے لگتی ہے ۔ ایسے میں جب اس کی شادی رچنے لگی ۔۔۔ گھر بھر میں دھوم دھڑکے کے ساتھ اس کی ہمجولیاں چھیڑ چھاڑ پر اُتر آئیں تو وہ من ہی من میں اترا گئی ۔ اور مانجھے کے پیلے پیلے لباس میں ۔ زندگی میں پہلی بار اس نے بڑی سوچی سمجھی، ہوئی نگاہوں سے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا ۔ لباس یہاں وہاں سے تڑخ رہا تھا ۔ ٹوٹ رہا تھا مانو کپڑے کا نہ ہو لکڑی کا ہو ۔ جو اندرونی مار سے چٹخ چٹخ جائے ۔ کالے بھنورلے بال ۔ بڑی بڑی پھانکوں سی آنکھیں ۔ کمر ۔ ؟ جو اللہ ہی جانے تھی بھی یا نہیں ۔

شادی ہو کر جب سسرال پہنچی ہے تو وہاں سے یہاں تک آتے آتے میں اس کے کانوں نے ریکارڈ کی طرح ہزار بار یہ جملہ سن ڈالا ۔ "دلہن تو پری ہے پری ۔"

"سراج کی تو قسمت کھُل گئی ۔"

لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے ۔

"یار مجھے تو شبہ ہے یہ شوکیس میں سجنے والا ماڈل نہ ہو بے جان ۔ ورنہ یار اتنا مکمل حُسن ۔"

"بھئی دلہنوں کی چال تو کپڑوں پھولوں گہنوں میں سمجھ ہی نہیں پڑتی ۔ مگر یہ لڑکی ۔ کیسا چلتی ہے ۔ اُف ۔ جیسے دو دھاگوں کو کوئی بانٹ دے کر مروڑی دے کر چھوڑ دے ۔ اور وہ بل کھا کھا کر اینٹھے ۔"

سراج نے گھونگھٹ اٹھایا اور بڑے ملتجیانہ لہجے میں بولا ۔

"گل اک ذرا کھڑی ہو جاؤ ذرا ۔ پلنگ میں تمہارے حسن کا نظارہ

کرنا چاہتا ہوں ـ‘‘

گل بانو اپنے بدن کو جھٹک کر، لال لال سرسراتے کپڑوں، گہنوں، پھولوں، خوشبوؤں اور لانبے لانبے بالوں کو چھٹکاتی یوں اٹھی کہ سراج چکرا کر رہ گیا ـــ پھر اس نے بلبوتری آنکھوں سے یوں دیکھا کہ سراج مٹ گیا۔ فنا ہو گیا ـــ بڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا ـــ اس کی سدا جھکی رہنے والی نگاہیں ـ اب جھکنے اور گل پر سے ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں ـ

بڑی مشکل سے، بہت ہی مشکل سے سراج نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ذہن پر زور ڈالکر سوچا کہ ’’اس پری کو میں کہاں چھپا کر رکھوں آخر ـ؟‘‘

وہ دھیرے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا ـ میز پر دو گلاس رکھے تھے ـ دودھ سے بھرے ہوئے ـ اس نے ایک اٹھا کر گل کی طرف بڑھا دیا ـ اور ایک ـــ ایک ہی سانس میں خود چڑھا لیا ـ گل نے انکار میں سر ہلایا اور ایسی آواز میں جیسے شیشے کے گلاس میں کانچ کے موتی بجیں ـ کھنکھناتی جھنجھناتی بولی ـ ’’اوں ہوں ـــ وہ بھی تم پی لیو ـ‘‘

سراج اب اور کچھ برداشت نہیں کر سکتا تھا ـ وہ کرسی پر سے یوں اٹھا جوں بھوکا شیر کچھار سے نکلتا ہے ـ

پہلی ہی رات میں گل بانو کا دماغ آسمان سے جا لگا ـ وہ شائد اپنے بے پناہ حسن سے بے بہرہ تھی ـ لیکن اس کا جو جوہری تھا وہ بڑا ہی سچا پارکھ تھا اس نے ہیرے کی قدر خوب پہچانی اور اس پر ظاہر بھی کر دیا کہ وہ حقیقت میں کیا تھی ـ گل بانو میں، ایک ہی رات میں عورت پن کے سارے سوئے ہوئے جذبے جاگ اٹھے ـــ سراج رات بھر ایک ریکارڈ کی طرح بجتا رہا تھا اور

گل بانو کے ذہن میں صرف ایک ہی گونج باقی رہ گئی تھی کہ وہ بے پناہ حسین ہے ۔ بے پناہ ۔

دوسری صبح جب سراج نہادھو کر اور ہلکے گرے کلر کا سوٹ پہن کر تیار ہوا تو کن انکھیوں سے گل بانو نے اسے دیکھا ۔ پہلے ذرا دبتے دبتے ۔ پھر منہ ذرا پھیر کر اور پھر باقاعدہ یوں دیکھنے لگی جیسے اس کا امتحان لے رہی ہو ۔۔ اور پہلے ہی لمحے اس کے ذہن میں جو خیال جاگا وہ یہ تھا کہ " اگر اماں بیگم اتنی جلدی نہ کرتیں تو یقیناً مجھ ایسی حسین کو اس سے بہتر شوہر مل سکتا تھا ۔"

گل بانو نے سراج کی دنیا ہی بدل دی ۔ وہ خاموش خاموش لڑکا جسے سوائے سر جھکائے جھکائے آفس جانے اور آنے کے اور کوئی کام سوجھتا ہی نہ تھا ۔ اب مسلسل بجتا رہتا ۔

" گل ۔ واقعی تیری آنکھیں کتنی پیاری ہیں ۔ کیسی لمبوتری ۔ کیسی کٹیلی ۔ اگر دسترخوان پر اچار نہ ہو ۔ اور صرف تو بیٹھی رہے تو تیری آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر اچار کی کمی پوری کی جاسکتی ہے ۔"

" گل ۔ دل چاہتا ہے یہ اپنی انگوٹھی تیری کمر میں پہنا کر دیکھوں ۔ مگر ڈھیلی ہوگئی تو ۔۔ ؟"

" گل ۔ تیرے گھنیرے بال ۔ چلو اچھا ہوا کہ تو نے سردیوں میں کوٹ بنوانے کے خرچ سے مجھے بچا لیا ۔"

گل کو ایسے پیارے ۔ ایسے تعریف بھرے ، ایسے لبھا لینے ایسے نرم ، ایسے محبّت والے انداز میں کسی نے آج تک "تو" کہہ کر نہ پکارا

تھا۔ کبھی ایسے دُلار سے بات نہ کی تھی ۔

ان تمام باتوں کا جواب ہوتا تھا بس ایک ہلکی سی مسکراہٹ ۔ جس کے نتیجے میں سراج کی رہی سہی زندگی بھی ختم ہو جاتی ۔ وہ حُسن کے بے پناہ احساس اور خوبصورتی کے نشے میں چُور تھی ۔ وہ اب صرف یہ چاہتی تھی کہ سراج اس کو پوجتا رہے اس کے حسن کے گُن گاتا رہے ۔

سراج کی بے پناہ تعریفوں نے اسے بھُلا دیا تھا کہ وہ حسن سے ہٹ کر بھی کچھ اور ہے ۔ بیوی ہے ۔ بہو ہے ۔ گھر والی ہے ۔ جس کے ذمے کچھ کام ہوتے ہیں ۔ ذمہ داریاں ہوتی ہیں ۔ سراج کو بس اب یہی دھن تھی کہ جیسے بھی ہو گل کو خوبصورت سے خوبصورت چیزیں لا لا کر پہناٹے اوڑھائے تاکہ وہ خوب سے خوب تر ہوتی جائے ۔

سراج کے آفس کے اوقات صبح ۱۰ بجے سے ۵ بجے تک تھے ۔ اب وہ مزید دو گھنٹے کام کر کے ۷۵ روپے زیادہ کمانے لگا ۔ تاکہ اتنے روپوں سے وہ گل کے لئے خوب صورتیاں خرید سکے ۔ خوبصورت ساریاں ۔ چمکیلے ایرنگ ۔ بالیاں ۔ نیکلس ، سینٹ پاوڈر ، لپ اسٹک ، ۔ جب بھی آفس سے آتا ۔ لدا پھندا آتا ۔ گل بانو ایک جادو بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی اور سراج کا کئی تولے خون بڑھ جاتا ۔ مگر حقیقت اپنی جگہ یوں تھی کہ کام کے اتنے دباؤ سے اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی ۔۔۔ اور پھر غذا کا کوئی مخصوص اہتمام نہ تھا ۔ اس نے یہ سوچ کر کہ گل بانو کی پھول سی جوانی گرمی اور آنچ سے کمھلا نہ جائے ، اُسے چولھے چکی کے بکھیڑوں سے بالکل ہی الگ رکھا تھا ۔ بس بوڑھی ماں جیسے بھی بنے پکا کر

سامنے لا دھرتیں — نوکر دسترخوان اُٹھاتا تو بولتا ۔
"ارے صاحب آپ نے کیا کھایا — سب تو ویسے کا ویسا ہے۔
سراج ہنس کر بیوی کی طرف دیکھتا اور بولتا ۔
"کھانے کی ضرورت ہی کسے ہے — ؟ اپنی تو بھوک پیاس سب ختم ہو کر رہ گئی ہے — "
گل بانو صرف ہنس کر رہ جاتی — اور کبھی کبھار اس کے سدا یوں تعریف کرتے رہنے پر بڑی زخمی نگاہوں سے اُسے دیکھتی اور چپ رہ جاتی — !
کام کے بار اور اس کے عشق کے بھیر میں سراج تو آدھا رہ گیا اور گل بانو جو تھی وہ پونم کا چاند بن کر جگمگانے لگی ۔
ایک دن چھٹی کے دن دونوں پکچر دیکھنے کے ارادے سے تیار ہوئے ۔ سراج نے گبرڈین کا سوٹ پہنا ، ٹائی لگائی ۔ چم چماتا جوتا پہنا اور جب باہر نکلا تو قیامت کو منتظر پایا — گل بانو نے شلوار ، لمبی سی قمیص اور چُنا ہوا الگا دوپٹہ پہن رکھا تھا ۔ بال سمیٹ کر اوپر جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے ۔ جو کانوں کو ڈھک کر کچھ گردن پر کرتے تھے ۔ اور کچھ اوپر اوپر رہتے تھے ۔ قمیص جہاں تنگ تھی وہاں تو تنگ تھی ہی ۔ پوچھنا ہی کیا تھا ۔ اور جہاں ڈھیلی تھی — وہاں کا بھی کیا پوچھنا تھا ۔ سراج تباہ ہو کر بولا ۔
" خدا کی قسم گل — میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ تجھ ایسی بیوی ملی
گل بانو بجید ہی کم باتیں کرتی تھی ۔ بولتی تھی تو اس وقت جب ضرورت سمجھتی

تھی ۔ اس کی اس بات پر اس نے سراج کو دیکھا جو اپنا دُبلا پتلا ڈول لیے بانس کی طرح مرجھلا مرجھلا سا لگ رہا تھا ۔ اور بولی

"تم تو ہو ۔ مگر میں ۔ ؟ اور خود ہی ہنس دی ۔ سراج سناٹے میں آگیا ۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا ۔

"گل واقعی تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ۔ حور، لنگور کی گود میں کہاں سجتی ہے ۔"

اکدم اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ۔ آج پکچر کی بات گل کی طرف سے اٹھی تھی ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رنگ میں بھنگ ڈال کر گل کی خوشی کرکری کردے ۔

پکچر دیکھ کر دونوں لوٹ بھی آئے ۔ مگر سراج کے دل پر ایسا کاری تیر بیٹھا تھا کہ وہ ہنس نہ سکا ۔ ضبط نے سر درد کی شکل اختیار کرلی ۔ اور رات گئے اسے سن سنا کر بخار چڑھ گیا ۔ ایک دن گیا اور دوسرا دن بھی گیا ۔ تیسرے دن بھی بخار نہ اترا ۔ تو امابی کے مسلسل بولنے پر گل اٹھی ۔ اسٹینڈ پر لٹکتی لہریئے دار جارجٹ کی ساری اٹھا کر لپیٹی اور ڈاکٹر کو بلانے چل دی ۔

ڈسپنسری میں مریضوں کی دھوم تھی ۔ مگر ڈاکٹر کی نگاہیں ۔ آپی آپ اُدھر کو اٹھ گئیں ۔ جدھر سے کہ ایک لڑکی ۔ لڑکی کاہے کو ناگن چلی آرہی تھی ۔ لچکتا بدن ، لچکتی ساری ، لچکتی چال ۔ ڈسپنسری میں تو بھونچال ہی آگیا ۔ ڈاکٹر نے بڑی شفیق اور مہربان سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا

"کہیۓ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں ۔"

"جی ۔ وہ پریشانی کے ساتھ بولی ۔ "میری تو نہیں ۔ ہاں میرے

شوہر کی خدمت کر دیں تو مہربانی آپ کی ۔"

"کیا ہوا ہے انھیں ۔"

"تین دن سے بخار ہے ۔ ٹوٹتا ہی نہیں ۔" اور اس نے بے چین سی نظر مریضوں پر ڈالی ۔ "اتنا ہجوم ! جانے آپ کو کب چھٹکارا ملے !"

"کوئی بات نہیں ۔" وہ جیبیں ٹٹولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا ۔ "میں ان سبھوں سے بعد میں نپٹ لوں گا ۔ آپ ضرورت سے زیادہ پریشان معلوم ہو رہی ہیں ۔ چلئے ۔"

ڈاکٹر کی کار میں بیٹھتے بیٹھتے گل بانو کو پسینہ آ گیا ۔

"کیا بات ہے ۔" ڈاکٹر سراسیمہ ہو کر بولا ۔ "آپ کچھ وحشت زدہ سی لگ رہی ہیں ۔"

اس نے بڑی سچائی سے اعتراف کیا ۔ "جی ہمارے پاس کار نہیں ہے، یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی کار میں بیٹھی ہوں ۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔" ڈاکٹر مسکرایا

اس نے صرف دیکھنے پر اکتفا کی ۔ ان آنکھوں کے بارے میں سراج کہتا تھا ۔ اچار کی پھانکیں دسترخوان پر نہ ہوں تو بھی کام چل جاتا ہے ۔

ڈاکٹر شفیق احمد مریض کو دیکھ کر واپس جانے لگا تو گل بانو اُسے چھوڑنے کار تک آئی ۔ فیس کے پندرہ روپے اس نے بڑھائے تو ڈاکٹر بولا ۔ "ابھی رہنے دیجئے ۔ مریض کی حالت ایسی ہے کہ شاید مجھے اور بھی آنا پڑے ۔" اور وہ معنی خیز انداز سے مسکرا دیا ۔

گل بانو نے پیسے واپس پرس میں ڈال لیے ۔ اچانک وہ بولا

"آپ کا نام — ؟" حالانکہ غیر ضروری سوال ہے۔

"گل بانو — !"

"ہونا ہی چاہیئے —"

"جی — ؟" وہ حیرت سے بولی۔ کیا کہا آپ نے —"

"جی میں نے یہ کہا کہ اگر آپ کی اماں یہ نام نہ رکھتیں تو بھلا اور کیا رکھتیں — آپ کا نام بس گل بانو ہی ہونا چاہیئے" اور کار زوں کرکے دوڑ گئی —

تیسرے دن ڈاکٹر شفیق اپنے آپ چلا آیا۔ کار کے رکنے کی آواز کے ساتھ گل بانو نے کھڑکی سے سر نکالا — شفیق اپنا بیگ سنبھالتا ہوا اُتر رہا تھا۔ وہ لپک کر دروازے میں آگئی —

"آپ — ؟"

جی ہاں میں —" وہ ہنسا۔ "ڈاکٹر کو مریض کی جتنی فکر ہوتی ہے اتنی تیماردار کو نہیں ہو سکتی — کیا خیال ہے آپ کا — ؟"

گل بانو مجوب مجوب سی۔ شرمندہ شرمندہ سی آگے آگے ہو لی — مریض کے کمرے میں آئے تو دیکھا کہ پلنگ پر سراج یوں پڑا تھا جیسے جان دار نہ ہو — شفیق آگے بڑھا۔

" معاف کیجیئے سراج صاحب — آپ کی حالت سے ایسا نہیں لگتا کہ بخار نے آپ کو زیر کیا ہے۔ صرف بخار اتنی تباہی نہیں مچا سکتا — کوئی اندرونی صدمہ اور ہے جو شائد آپ مجھ سے بتانا نہیں چاہتے —"

گل بانو اور سراج نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا —

دوسرے لمحے دونوں پرسکون تھے مگر سراج کہہ رہا تھا۔

"نہیں ڈاکٹر اللہ کا فضل ہے کہ میری زندگی قابل رشک ہے میرے آگے پیچھے آس پاس کوئی غم، کوئی دکھ، کوئی صدمہ نہیں ہے۔ جس کی اتنی پیاری بیوی ہو اُسے غم ہو بھی کیا سکتا ہے ڈاکٹر۔؟ بس میری تمنّا تو یہ ہے کہ گل بانو سُکھی رہے۔ خوش رہے۔ البتہ اس صدمے سے ضرور نڈھال ہوں کہ یوں پلنگ پر پڑ جانے سے میری گل کو میری تیمارداری کرنی پڑ رہی ہے جس کی وجہ سے اسے تکلیف ہو رہی ہوگی۔"

گل بانو بڑی حیرت اور ڈاکٹر بڑے صبر سے اس کی بات سنتے رہے

"آپ کو اپنی بیوی سے بہت محبّت ہے سراج صاحب۔" ڈاکٹر ہنسا۔

سراج نے بےچینی سے پہلو بدلا۔ "آپ محبت کا کہہ رہے ڈاکٹر صاحب اور میں کہتا ہوں کہ مجھے وہ اتنی عزیز ہے کہ میں اس کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ یہ شاعروالی بات نہیں ہے ڈاکٹر۔ ہاں میں اپنی جان۔ اپنی خوشیاں۔ اپنا سب کچھ اُسے دے سکتا ہوں۔ میں بہت خوش نصیب ہوں ڈاکٹر کہ گل بانو جیسی بیوی مجھے ملی ہے۔

"ہاں سچ تو ہے۔" ڈاکٹر نے انجانے میں تیر چلایا۔ "سچ مچ آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ ایسی بیوی ملی۔ ہمارے ہندستان میں مرد ہی عموماً خوش نصیب ہوتا ہے۔ کہ اچھی سے اچھی، حسین سے حسین بیوی اسے مل جاتی ہے۔ اور عورت کے سلسلہ میں یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ اونہہ مرد کی صورت کیا دیکھنا۔ اس کی پرسنلٹی، صورت، سیرت کچھ نہیں دیکھا

جاتا اس لئے کہ وہ مرد ہوتا ہے۔"

سراج جیسے درد سے بے چین ہو کر بولا۔ "ڈاکٹر۔ یہاں بہت درد ہوتا ہے۔" اس نے اپنا دل پکڑ رکھا تھا۔ ڈاکٹر تیزی سے آلہ لے کر اس پر جھک گیا۔

گل بانو ڈاکٹر کو چھوڑنے آئی تو اس نے بڑے نرم اور بڑے بے تکلف لہجے میں کہا۔

"واقعی مسٹر سراج بہت ہی خوش نصیب ہیں۔"

گل بانو نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔ ڈاکٹر ہنسا۔ "اوہ۔ آپ کس قدر کم سخن ہیں میری تو آپ سے بہت مختصر ملاقات ہے۔ لیکن میں نے محسوس کر لیا ہے کہ آپ اپنی زبان سے بہت کم کام لیتی ہیں۔ جانے آپ نے مسٹر سراج سے اب تک کتنی باتیں کی ہوں گی۔ صرف دو۔ یا چار۔ یا کیں ہی نہیں۔؟"

گل بانو نے ڈاکٹر کو بہت ہمدرد کے روپ میں پایا تو جیسے کھل اٹھی

"اصل میں میرا دل ان سے ملا ہی نہیں۔"

"ہائیں۔؟" ڈاکٹر سچ مچ چونک اٹھا۔

"ہاں۔ وہ مسکرائی۔ بقول آپ کے مرد کی صورت پرسنلٹی وغیرہ کو تھوڑی ہی دیکھا جاتا ہے۔ بس پیام آیا۔ شادی ہو گئی۔ کیونکہ سراج کی تنخواہ تین سو تھی۔"

ڈاکٹر نے بڑا کڑوا منہ بنایا انجانے میں تیر چلا کر بولا۔

"خیر۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے مگر میں اپنی حد تک کہہ رہا ہوں۔

کہ تین ہزار ماہانہ آمدنی ہے مگر پھر بھی جب تک میں یہ پتہ نہ لگوالوں کہ میری ہونے والی بیوی مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں - میں ہرگز شادی نہ کروں گا۔ "

"تو آپ غیر شادی شدہ ہیں -" گل بانو چیخنے کے انداز میں بولی

وہ ہنسا - "کیوں کیا میں بہت معمر لگتا ہوں - ؟"

گل بانو جیسے ہار کر بولی - " تو سراج کون سے ینگ لگتے ہیں -"

ڈاکٹر کو جیسے یقین نہ آیا کہ گل بانو اس حد تک آگے بڑھ سکتی ہے۔ وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر بولا -" کاش آپ ایک آدھ بار ہی بیمار ہوئی ہوتیں اور ایک آدھ بار ہی کبھی میری ڈسپنسری آئی ہوتیں"۔

گل نے عورت بن کر پوچھا -" اس سے کیا فرق پڑ جاتا - ؟"

ڈاکٹر نے جھک کر اسے دیکھا - اور ذرا غصّے سے بولا- "تم صورت سے تو اتنی نادان نہیں لگتیں گل بانو -" اور تیزی سے مڑ کر دیکھا اور کار میں گھس گیا۔

وہ کمرے میں لوٹی تو سراج کی دوا کا وقت ہو چکا تھا- اس نے بے دھیانی سے پیالی میں الٹی اور قریب آکر بولی۔

"سراج دوا پی لو -"

اس کا وہ گھریلو لہجہ - وہ ایکدم گہری محبت دلا دینے والا انداز -" دوا پی لو -" وہ تڑپ کر بولا۔

" تمہارے ہاتھ سے تو مر جانا بھی قبول ہے گل - لاؤ میں یہ اسپرٹ بھی پی سکتا ہوں -"

وہ چونکی اور اکدم آگاہ ہوئی کہ وہ اتفاقاً بے دھیانی میں اس نے اسپرٹ کی شیشی انڈیل دی تھی جو انجکشن لگاتے وقت ڈاکٹر یوز کیا کرتا تھا

" اوہ — مجھے معاف کر دیو سراج —" وہ پلٹی اور دوسری پیالی میں دوا انڈیلنے لگی۔

"گل —" سراج نے بے حد محبت سے پکارا

"ہوں —"

"میں تمہاری خوشی کی خاطر طلاق بھی دے سکتا ہوں — تم ڈاکٹر سے شادی کر لیو۔ کیونکہ وہ تمہیں پسند ہے۔"

گل بانو اس بری طرح چونکی کہ دوا کی پیالی، شیشی اور خود، سب کچھ ایک زور دار چیخ کے ساتھ زمین پر آ رہا۔

"سراج — یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" اس کا سینہ شدت وحشت سے اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ جس کے بارے میں سراج کہتا تھا" خدا کی قسم گل — تجھے ہزار بار چھو چکا ہوں، استعمال کر چکا ہوں، برت چکا ہوں پھر بھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ تیرا یہ حسن مصنوعی ہے۔"

مگر سراج سطح سمندر کی طرح پرسکون تھا — اسی ٹھنڈے انداز میں بولا "گل — صرف ایک نظر محبت کی کافی ہوتی ہے میری جان — اگر میں نے غلط سمجھا ہو تو — مگر نہیں میں غلط نہیں سمجھ سکتا — مگر ڈر ہے کہ وہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکا تو —" وہ رکا — اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا — "گل میں نے غلط نہیں کہا ہے میں تمہاری خوشی کی خاطر اپنی جان تک دے سکتا ہوں — اپنا سب کچھ — ساری خوشیاں۔

اپنی زندگی بھی ۔ تم میری زندگی نہیں تو کیا ہو گل ۔ ؟"

دوا بہہ چکی تھی ۔ سارے میں کرچیاں بکھر گئی تھیں ۔ گل وہیں فرش پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی ۔ سراج کے اس طرح کہنے پر سر اٹھا کر بے بسی سے بولی ۔

"خوب بدلے لیو سراج ۔ خوب بدلے لیو ۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ؟"

ڈاکٹر روز آتا ، انجکشن لگاتا ، دوا پلانے کی تاکید کر کے چلا جاتا سراج کی طبیعت سنبھل گئی ، ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا تھی ورنہ سراج خود بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ جانے کتنے دن ابھی طبیعت سنبھلنے میں لگ جائیں گے ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو وہ آفس بھی جانے کو تیار ہو گیا ۔ گل بانو نے اسے روکنا چاہا ۔ مگر جیسے ہی وہ کپڑے پہن کر باہر نکلا ۔ گل کے احساسات پھر سرد ہو گئے ۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں اس کا دبلا پتلا جسم اور زیادہ ہونق لگ رہا تھا ۔ بس ایسا لگ رہا تھا کھیتوں پر سے کوّے چڑیاں اڑانے "ڈمی بنا کر کھڑی کر دی گئی ہے ۔ اور پھر اس کا اپنا جسم کہ جس میں چٹکی بھرنا بھی مشکل تھا ۔ تنا ہوا ۔ کسا ہوا ۔ کھال ایسی چکنی کہ کبھی گردن پر سے پسینہ کی بوند پھسلے تو سیدھی ٹخنے پر ہی آکر رکے ۔ اس نے بمشکل پوچھا ۔

"ابھی سے آفس بھی جانے لگے ۔ ؟"

سراج نے کوئی جواب نہ دیا ۔ صرف ہنس کر رہ گیا ۔

دوپہر میں جبکہ گھر میں کوئی نہ تھا ۔ نوکر اپنے ساتھیوں سے گپ لڑانے کہیں چلا گیا تھا ۔ اماں بیٹی کے یہاں گئی ہوئی تھیں ۔ اس نے اس

تنہائی کا شکریہ ادا کیا۔ اپنا بکسا کھولا۔ سب سے جاذب نظر ساڑی نکالی ۔ بالوں کو ڈھیلے جوڑے کی شکل دی۔ تباہ کن سنگار کیا۔ اور گھر سے نکل پڑی۔

ڈاکٹر آخری مریض سے بس نپٹ ہی رہا تھا۔ سامنے سے قیامت نظر آئی۔ خوش ہو کر پوچھا۔ "کہیئے آپ کے مریض کے کیا حال ہیں؟"

"وہ تو اچھے ہیں —" اور وہ رُک گئی۔

"آپ کا جملہ قطعی ادھورا ہے۔" وہ عاشقوں کے انداز میں بولا۔

"قطعی ادھورا نہیں ہے"۔ وہ رکی — "ویسے جملے کا کیا ہے اپنی زندگی ہی ادھوری ہے۔" وہ جلدی سے پرس ٹٹولتی ہوئی بولی۔

"اب تو آپ کو ایک ساتھ روپے لینے میں اعتراض نہیں ہے — کتنے ہوئے —؟"

عورت جب اس حد تک ڈھیل دے اور مرد پھر بھی فائدہ نہ اُٹھائے تو وہ بالکل اُلو ہے۔ ڈاکٹر نے سوچا اور ہنس کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بس بس ابھی رہنے دیجیئے۔ میں کہاں بھاگا جاتا ہوں۔!"

گل بانو نے اپنے اور اس کے ہاتھ کو ساتھ ساتھ دیکھا اور نگاہ اٹھا کر بڑے تپے ہوئے لہجے میں بولی،

"اور جو میں ہی بھاگ گئی تو —؟"

ڈاکٹر ہنسا — "اتنا یقین ہے کہ اگر آپ بھاگیں بھی تو اس خاکسار کے ساتھ ہی بھاگیں گی۔"

گل بانو کے ہاتھ سے پرس چھوٹ گیا۔ وہ تیزی سے کچھ بولنے کو

ہوئی مگر پھر چپ رہ گئی

"بُرا لگ گیا ۔" وہ بڑی چاپلوسی سے بولا

گل بانو کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا جواب دے ۔!

ڈسپنسری خالی ہو چکی تھی ۔ لیب بوائے اور کمپونڈر بھی جا چکے تھے ۔ ڈاکٹر اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھا اور بہت سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔

"اگر آپ کی ازدواجی زندگی واقعی ناخوشگوار ہے تو کیوں نہیں کوئی فیصلہ کر لیتیں ۔؟"

گل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن وہ کہے گیا ۔" مسٹر سراج آپ کو طلاق دینے پر راضی ہیں اور میں ۔" وہ رُکا ۔" اور میں آپ کو اپنانے ۔ تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے۔؟ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟"

" نہیں نہیں ۔" وہ چیخی ۔ ایسی بات نہیں ۔ مجھے یہ ڈر ہوتا ہے آپ یہ نہ سوچنے لگیں کہ میں آپ کے پیسے پر مرمٹی ہوں ۔"

"توبہ ۔ آپ بھی کن باتوں کو لے بیٹھیں ۔ یہ باتیں تو بڑی نیچی ذہنیت والے سوچا کرتے ہیں۔ روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے ۔ اصل چیز محبت ہے ۔ آپ مجھے چاہتی ہیں، میں آپ کو چاہتا ہوں ۔ بس ہمارے لئے یہی کافی ہے ۔"

مجھ میں دو قدم بھی چلنے کی سکت نہیں ہے ۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی ۔" کیا آپ مجھے اپنی کار میں گھر پہنچا دیں گے ۔

" اپنی کار ۔؟ وہ ہنسا ۔ سرکار ۔ وہ اب آپ کی کار ہے۔

— تشریف لائیے —" اور وہ خوشی سے جھومتا چلنے لگا۔

شام کو سراج دفتر سے آیا تو دیکھا کہ گل بانو اتنی حسین نظر آرہی ہے کہ آج تک کبھی نہ آئی تھی — سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھوں میں رچا ہوا کاجل تھا کہ اسے گود میں بھر کر چوم چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔ کپڑے بدل کر ابھی وہ بیٹھا ہی تھا۔ کہ گل بانو ایک سفید کاغذ لئے آئی اور بولی

"آپ اس پر یوں لکھ دیں کہ میں نے اپنی خوشی سے گل بانو کو طلاق دے دی —" اس کا لہجہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔

سراج نے اپنی ہمیشہ کی نرمی سے — یوں جیسے چائے کی پیالی تھاما کرتے ہیں، کاغذ تھاما — پن کھولا — اور سر جھکا کر بڑی متانت اور بڑے سلیقے اور سلجھے ہوئے نرم انداز میں لکھنے لگا۔

"میں سراج محمد اپنی بیوی گل بانو کو طلاق دیتا ہوں — مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے، مگر صرف اس کی خوشی کی خاطر لکھتے لکھتے پتہ نہیں سراج کو کیا ہوا — اس نے تیزی سے پن کو میز پر پٹخا — میز کو پاؤں سے دھکیلا اور لڑکھڑا کر اٹھا — اُٹھ کر اپنی پوری طاقت سے گل بانو کو اُٹھا کر نیچے پٹخ دیا اور تابڑ توڑ گھونسوں اور لاتوں کی بارش شروع کر دی۔ ہاتھوں اور پاؤں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چلتی جا رہی تھی۔

" حرام زادی، کمینی — میں نے تیری خوشی کی خاطر کیا کیا نہ کیا اپنی جان کو جان نہ سمجھا — اپنی صحت تباہ کی — اپنی زندگی خراب کر لی تیرے پیچھے میں زن مرید کہلایا — لوگوں نے ہیجڑہ تک کہہ دیا — تیرے

لیے میں مر مٹ گیا اور اب مجھے تباہ کر کے طلاق لے رہی ہے۔
لے کتیا ۔ سور کی بچی ۔ لے طلاق ۔" اور وہ ایک مشاق کھلاڑی
کی طرح گل بانو کو گیند جان کر کک پہ کک لگانے لگا۔

جب مارتے مارتے سراج کا دم اُلٹے گیا ۔ ہاتھ پاؤں،
بے دم ہو گئے ۔ تو وہ پلٹا اور دھم سے کرسی پر گر پڑا ۔ اس کا سانس
پھول رہا تھا ۔ جسم پسینے پسینے ہو کر بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا، آنکھیں
اُبل رہی تھیں ۔ مگر اب ان تمام جذبوں پر سب سے بھاری جذبہ یہ
حاوی تھا کہ اس نے گل بانو کو مارا ہے ۔ کیونکر مارا ہے ۔ اور اب
وہ اس سے کیسے آنکھیں چار کر سکے گا ۔ اس کی پیٹھ گل بانو کی طرف
تھی ۔ یہ بہت اچھا تھا ۔ مگر پھر بھی گل بانو کی کراہیں ۔ دبی دبی سسکیاں
اور آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ ناک سڑکنے کی آوازیں اس کے کانوں میں
سچ مچ کا جلتا تیل انڈیل رہی تھیں ۔ یہ بہت اچھا ہو گیا تھا کہ اب اسے
گل بانو سے نظریں چار کرنے کی ضرورت بھی نہ رہ گئی تھی ۔ اور یہ کہ اسے طلاق
بھی دے چکا تھا ۔ ورنہ اس ذلیل حرکت کے بعد تو وہ کبھی بھی اس سے آنکھیں چار
نہ کر سکتا تھا ۔ اکدم اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیروں کو کسی ٹھنڈی ٹھنڈی چیز
نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے ۔ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا تو گل بانو اپنے ٹھنڈے
ٹھنڈے پسیجے ہوئے ہاتھوں میں اس کے پیروں کو لئے اس پر اپنے گدرے
گدرے گال رگڑ رہی تھی ۔ اور سسک سسک کر کہہ رہی تھی ۔

"مجھے کیا پتہ تھا کہ تم مجھ سے اس قدر گہری محبت کرتے ہو ۔
آج سے پہلے تو تم نے کبھی اس محبت کا اظہار نہ کیا تھا ۔ اگر ۔ اگر

..... مجھے پتہ ہوتا کہ تم مجھے اس قدر بے پناہ چاہتے ہو تو میں
کاہے کو یوں بھٹکتی — ؟"

وہ اس کی آنکھوں میں اپنی زخمی نگاہیں ڈبو کر بولی — "میں صرف
تمہاری ہوں سرجو۔ صرف تمہاری ———————
خدا کی قسم ۔

جنّت کی راہ

دلان کی پچھلی طرف سے نرگس دوڑتی ہوئی آئی اور ہانپتی ہوئی آواز میں بولی ۔ "اے بی بی جلدی کیجیئے ۔ صنوبر بچہ دے رہی ہے ۔"

بڑی بیگم نے ایک زوردار دھڑاک کے ساتھ پاندان کے ڈھکنے کو گرایا اور کچھ مسکراتی ، کچھ جھلاتی ہوئی بولیں ۔

"آج اس کی شادی کردو تو اگلے برس بچہ جننے کو تیّار ہو جائے اور دیکھو تو کم بختیا کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ۔ میں پوچھوں کیوں ری بچہ بھینس دیتی ہے یا عورت ۔ ؟"

ماما نے ہنس کر بی بی کی بات سے بات ملائی ۔ "بی بی یہ آپ کا لاڈ پیار ہی تو ہے کہ شادی کے قابل ہوتے ہولتے بھی سب اپنے آپ کو بچہ جانتے ہیں ۔ اور بات کرنے کی گت بھی نہ آئے ہے ۔"

مگر ماما کی بات پوری ہونے سے قبل ہی بڑی بیگم لپک جھپک کے

انگلی سے ہلکا چونا چاٹتی نوکر خانے تک پہنچ چکی تھیں۔ وہاں دیکھا تو سچ مچ صنوبر کا حال تباہ تھا۔ درد کی شدت سے پہلے سے اس کا منہ ہرا نیلا پڑ چکا تھا۔ دائی اپنی سی کوشش کر کے ہار چکی تھی۔ صنوبر کا حال دیکھا نہ جاتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک جتنی مامائیں، نوکرانیاں، ان کی ملنے جلنے والی دایاں تھیں سب بدحواس تھیں سبھوں کی زبانیں آپ ہی آپ دعائیں مانگے جا رہی تھیں۔

"مولانا نور خاں کا باغ ہنستا رکھیو۔"

"خدایا پہلن ہے، ارمان بھری جان ہے اپنا فضل کریو۔

نور خان باہر کھڑا ہوا اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ کیسے کیسے ارمانوں سے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لایا تھا۔ ابھی سال بھی تو نہ گزرا تھا، دھان پان سی لڑکی نو مہینے بچے کو سنبھالتے پیلی پڑ چکی تھی۔ اللہ نے اُسے اتنی استطاعت دی ہی نہیں تھی کہ پھل پھلاری دودھ گھی کھلا کر معاملہ کو صحت کی طرف پھیر لیتا۔ اور غریبوں کے دن جس طرح گزرتے ہیں۔ ایسے ہی نور خان اور صنوبر کے بھی گذرتے تھے۔ اسپتال لے جانے کا نہ تو حویلی میں رواج تھا نہ اس کی ضرورت ہی سمجھی۔ اپنے باوا اماں نے ہی کون سا ہسپتالوں میں جنم لیا تھا کہ ہم انگریز میموں سے مشورہ لیتے رہیں۔

"ارے خدایا! مر گئی مولا میری مشکل آسان کر دے۔" صنوبر کی باریک اور تیز چیخ نے خدا نے سن لی اور واقعی اس کی مشکل آسان کر دی — صنوبر کی چیخ کے ساتھ ہی ایک اور ننھی منی چیخ اس دنیا میں گونجی۔ دائی نے اعلان کیا "بیٹی"

لیکن دائی کی بات سننے کی کسی کو فرصت نہ تھی، سبھی اور خاص طور پر

بڑی بیگم اس خون کی ندیا کو سہم کر دیکھے جا رہی تھیں جس میں کسی کی زندگی کی ناؤ ڈولتی ڈگمگاتی جا رہی تھی، ڈوبی جا رہی تھی۔

"ہائے میّا" دائی سہم کر بولی۔ دیکھنے دکھانے کو تو سوکھے پتے سار بیل تھی اور یہ ندی"؟

بڑی بیگم حیران پریشان پتھر سی مورت بنی کھڑی تھیں۔ وہ بڑی ہی حوصلے والی عورت تھیں، پریشانیوں کو مسکرا کر ٹال جانے والی، بڑے سے بڑے اور کٹھن سے کٹھن لمحات میں بھی ان کی مسکراہٹ ملیامیٹ نہ ہو پاتی تھی۔ ان کی سوچ کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اگر وہ اتنی ہمّت والی نہ ہوتیں تو اپنی زندگی بغیر مرد کے سہارے یوں نہ گزار سکتیں۔ ان کی ساری زندگی یوں ہی گزر رہی تھی کہ ایک دیوار آڑے، بازو گھنگھرو جھنک رہے ہیں۔ اور طبلہ دھنک رہا ہے۔ اس چھن چھن اور دھن دھن کے ہتھوڑے زندگی بھر ان کے دل پر ایسے پڑے کہ وہ فولاد بن کر رہ گیا۔ مگر اس وقت وہ سارے حوصلے بھول چکی تھیں۔ یہ نہیں کہ انھوں نے آج تک کوئی موت نہ دیکھی ہو۔ کون بشر ایسا ہوگا جس نے اپنی زندگی میں ایک دو بار حیات کا تار ٹوٹتے نہ دیکھا ہو۔ بڑی بیگم بھی کوئی الگ نہیں تھیں۔ لیکن زندگی کا یہ روپ وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔ جب کوئی اپنے جیون کا سارا رس کسی ایک ننھے منے پودے کو دے دیتا ہے کہ وہ پھولے پھلے اور خود فنا ہو جائے

بڑی بیگم نے بچوں کے سے ڈر جانے والے جذبے کے ساتھ سہم کر صنوبر کی طرف دیکھا جس کا سونے کی طرح پیلا اور دمکتا ہوا چہرہ ابھی ابھی دائی نے سرخ چادر سے ڈھک دیا تھا۔ وہ سہاگن مری تھا۔ اسے ایک

دلہن کی طرح پورے سنگھار رچاؤ اور سرخ لباس میں دفنایا جائے گا۔ اسے ایک بار پھولوں کا گہنا پہنایا جائے گا، ایک بار پھر اس کا دولہا اس کی ڈولی کو سہارا دے گا۔ وہ دلہن بن گئی ہے نا۔

بڑی بیگم نے لرز کر دیکھا۔ سامنے اس کا دولہا کھڑا تھا ابھی جب سال بھر پہلے جب بڑی بیگم خود بیٹے کی طرح پال پوس کر جوان کئے ہوئے اس بیٹے کو دولہا بنا کر دلہن بہو کو لانے کے لئے گئی تھیں تو یہی چہرہ خوشیوں اور امیدوں سے کس طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ آج چہرے کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور دل کی وادیوں میں گھٹا ٹوپ اندھیروں کا راج تھا۔

دائی نے ننھی منی گڑیا کو چادر میں لپیٹ کر باپ کی گود میں دے دیا۔

باپ نے ایک لمحے کو اسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پھپھک عورتوں کی طرح رو پڑا۔

"میں اسے کیسے پالوں گا، میں کیا کروں گا خدایا۔"

ایک دم بڑی بیگم ہوش میں آگئیں۔ میاں کی بیوفائی سے ٹوٹا ہوا دل انہوں نے ہمیشہ اسی طرح جوڑنے کی کوشش کی تھی کہ سدا دوسروں کے غموں کو اپنا جانا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ ان کی عادت اور ان کی فطرت بن گئی اور اب یہ تھا کہ خدا ترسی کا ایسا جذبہ ان کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ وہ کہیں ایسے موقع پر پیچھے نہ ہٹیں۔ ان کی اپنی تو لے دے کے دو ہی اولادیں ہوئیں — جو جوان ہونے کے بعد بیاہی بھی جا چکی تھیں۔ بیٹی اپنے گھر کی تھی اور بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں میں چھوٹے سے رجواڑے کو سنبھالے ہوئے تھا اور بڑی بیگم کی زندگی کا اب یہی مصرف تھا کہ کسی یتیم لڑکی کو لے کر پال لیا

کسی ناجائز اولاد کو کلیجے سے لگا لیا۔ کوئی بھیک مانگتی حویلی کے دروازے پر آنکلی تو اسے اپنے دامن میں پناہ دیدی۔ کسی نے لجاجت سے دو روٹی مانگی تو انھوں نے گھر کا کونہ ہی دیدیا۔ بے پناہ دولت کے خرچ کا انھوں نے یہی ذریعہ ہی بنا رکھا تھا۔ ان کی حویلی کیا تھی، اچھا خاصا لنگر خانہ تھا پھر یہ تھا کہ پالی پوسی لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی خود ماں بن کر کر رہی ہیں کسی کی بسم اللہ کا ہنگامہ رچا رہی ہیں۔ کسی کی ختنہ کا دھوم دھڑاکا مچا رکھا ہے۔ ایسے میں وہ گھنگرو کے چھنکے اور طبلے کے دھمکے بالکل بھول چکی تھیں۔ وہ سوچتیں میرا دل تو دنیا میں بہل ہی گیا۔ عاقبت بھی خدا ضرور روشن کر دے گا۔ کسی یتیم یسیر کے سر پر ہاتھ پھیر دینے سے اتنی نیکیاں شمار ہوتی ہیں جتنے کہ اس کے سر پر بال۔ تو یہاں صرف سر پہ ہاتھ پھیرنے کا سوال نہ تھا وہ تو جسے بھی اپنی گود میں ایک بار لے لیتیں۔ خدا کے بعد یہ اس کا واحد سہارا بن جاتیں، اس کی زندگی سنوار دیتیں۔ اس کی خوشیاں ان کی اپنی خوشیاں بن جاتیں۔ اور اس کا ہلکا سا غم بھی ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتا۔ نور خان بھی انھیں کا پروردہ تھا بعد میں تھوڑا بہت پڑھا لکھا کر انھوں نے اپنی زمینوں کا حساب رکھنے کے لئے منشی کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کی شادی بھی انھوں نے اپنی پسند سے پچھلے سال ہی کرائی تھی انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ نئی نئی بہار سے بھری یہ بگیا دم بھر میں یوں اُجڑ کر رہ جائے گی۔

نور خان حویلی سے ملحق ہی ایک کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی حیثیت نوکروں کی سی نہ تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور دوسروں کے

علاوہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اوروں سے ذرا ممتاز سمجھتا تھا اس نے بڑی بیگم سے کہہ رکھا تھا اور بڑی بیگم نے وعدہ کر لیا تھا کہ صنوبر کے ماں بننے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی زمین پر خود کاشت کر کے خود ممتاز زندگی گزار سکتا ہے۔ بڑی بیگم نے زمین بھی اس کے نام بھی کر دی تھی لیکن بیس ایکڑ زمین پر جا کر بسنے کی بجائے صنوبر نے پانچ ہاتھ کے ٹکڑے کو زیادہ ترجیح دی۔ اب سارے ارمان دفن ہو چکے تھے۔ اور وہ کہ جس کے دل میں ایک لمبی اور بھری پری زندگی گزارنے کا ارمان تھا کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"میں اسے کیسے پالوں گا؟ میں کیا کروں، خدایا؟"

"لاؤ میاں، اسے مجھے دیدو۔ میں نے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا تو کیا اس ننھی منی جان کو نہیں کر سکتی۔" بیگم کا لہجہ ایک دم اعتماد سے بھر گیا تھا۔

نور خاں کے بہتے آنسو ایکدم رک گئے۔ ارے خدا کے بعد اس عظیم سہارے کو وہ کیسے بھول گیا تھا۔؟ وہ زندگی کو بوجھ کیوں تصور کر بیٹھا تھا۔ ان تجربہ کار ہاتھوں اور خدا ترس اور محبت بھرے دل میں چھپ کر تو یہ ننھی کلی دنوں میں ہی پھول بن جائے گی۔ میں کیوں فکر کرتا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر میں لپٹی ننھی سی جان بے حد مضبوط ہاتھوں میں دے دی۔

اس ذمہ داری پر بڑی بیگم کا دل ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اس سے کہیں عظیم سے ذمہ داریاں اپنے سر لے چکی اور انھیں نبھا چکی تھیں۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی ذمہ داری تھی کہ اتنی ننھی

سی جان کو جو ابھی چند گھنٹے کی بھی نہ ہوئی تھی، ان کے سایۂ عاطفت آئی۔ آج تک کے پلنے والے بچوں میں کوئی دو سال سے کم کا نہ تھا لیکن یہ جان جس نے ماں کے دودھ کو منہ تک نہ لگایا۔ اوپر کے دودھ سے کس مصیبت سے پلے گی۔ لیکن ان کے کانپتے دل کو قرار اسی لمحے آگیا۔ جب انھوں نے ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ جتنی کٹھنائیاں مجھے پالنے پوسنے میں درپیش ہوں گی۔ جنت کا اتنا ہی اونچا مقام مجھے ملیگا۔ اور وہ بے حد پرسکون ہوگئیں۔

بڑی بیگم کا یہ دور سب سے جدا تھا۔ نئے تجربے ہو رہے تھے۔ نئی نئی مشکلیں پیش پڑ رہی تھیں۔ اور دل سمجھاتا تھا انھیں ننھا منا دب مت دو۔ یہ بڑے بڑے معرکے ہیں۔ جو تمہاری جنت کو جانے والی راہوں کو استوار کر رہے ہیں۔ بڑی بیگم کے اپنے بھی دو بچے ہوئے تھے، مگر ان بچوں کو پالنے اور اس بچی کو پالنے میں واقعی زمین آسمان کا سا فرق تھا۔ وہ ان کے خود کے بچے تھے۔ وہ ماں تھیں، خود ہی اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ اوپر کے دودھ کی کھٹ کھٹ اور مصیبت کا انھیں کچھ اندازہ ہی نہ تھا پھر یہ تھا کہ اپنے بچے اپنے ہی بچے ہوتے ہیں۔ مارو۔ ٹھونک دو۔ غصہ آئے تو پٹخ دو۔ کون بازپرس کرنے والا ہے۔ مگر اب وہ بات نہ تھی۔ ہر چند کہ یہ اپنی ہی بچی جیسی تھی مگر اس کی مسلسل روں روں سے تنگ آکر کبھی ان کا جی اسے آدھ دھپ جڑ دینے کو چاہتا تو ایسا لگتا کہ خدا کی آنکھیں صرف انھیں پر مرکوز ہیں۔ اور وہ ڈگمگا جاتیں۔ ایسے مجھے جنت کیسے مل پائے گی۔؟

ان کے اپنے بچوں پر آیا ئیں تھیں۔ میاں لاکھ بے وفا اور بددل تھے مگر مرد کا پورا کمینہ پن ان میں موجود تھا۔ جو عورت کو تو جوتی تلے کی چیونٹی سمجھتا ہے مگر اولاد کو بھرپور پیار دیتا ہے

اور اس کی آسائش اور آرام کا پورا خیال رکھتی ہے۔ نواب صاحب بھی بالکل مرد تھے۔ بیوی کو جتنی بے توجہی بخشی اولاد کو اتنی ہی توجہ اور محبت کی گرمی دی۔ چیں کی آواز سنتے تو دوڑے آتے کہ بچہ کیوں رویا۔ انھوں نے ایک ایک بچے پر دو دو آیائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ دودھ ماں ہی پلاتی تھی۔ نگرانی بھی ان کی اپنی ہی تھی۔ یہاں یہ اڑچن آن پڑی تھی کہ اگر آیا رکھتیں تو خدا کے آگے جواب دہ ہوتیں کہ اپنے برتے پر لیا تھا تو پھر آرام کی کیوں سوچی۔ ڈبے کا اوپر کا دودھ بنانا، رات بے رات جاگنا، اپنے ہاتھوں گو موت کرنا، بس بڑی بیگم بن داموں کی غلام بن کر رہ گئیں۔

انہیں دنوں دل ہلا دینے والا ایک واقعہ رونما ہو گیا۔ نور خان زمینوں پر سے حساب کتاب کی جانچ کر کے بیل گاڑی میں واپس آرہا تھا کہ بیل گاڑی اوبڑ، کھابڑ راستوں سے پتھروں سے ٹکراتی نیچے آپڑی اور اس کے تلے نور خان مرچ دھنیے کی طرح پس کر رہ گیا۔ جانے والا تو اپنی جان سے گیا۔ مگر بڑی بیگم ذمہ داری کے دہرے بوجھ تلے، دب گئیں۔ وہ ایک معصوم یتیم یسیر کی نگہ دار ٹھہریں۔ کیسے کڑے مقام پر خدا نے انھیں لا کھڑا کر دیا تھا۔ انھیں اس بوجھ سے اپنی کمر ٹوٹتی محسوس ہوتی۔ مگر اسی خدا ترسی کے جذبے اور جنت کی آس نے انھیں سہارا دیا۔ اور وہ تن من دھن سے جٹ گئیں۔ ننھی چونکہ ان کی عاقبت کی خوشیوں کا سہارا بن کر آئی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس کا نام مسرّت رکھا۔ ویسے تو انھوں نے ہزار نام دے رکھے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک سگی ماں اپنی سگی اولاد کو ہزاروں ہی پیار بھرے ناموں سے پکارتی رہتی ہے۔

بڑی بیگم نے اب تک جتنے بھی بچوں کو پالا تھا یہ سمجھ کر پالا تھا کہ بس بچے ہیں، پل جائیں، بڑے ہو جائیں۔ اپنے اپنے ٹھکانوں سے بیٹھ جائیں۔ مگر مسرت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انھوں نے ایک دن ہر خاص دعام میں اعلان کر دیا کہ مسرت میری بیٹی ہے۔

کسی بات کو منہ سے کہہ دینا اور ہے نبھانا اور مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بڑی بیگم نے منہ سے یہ بات نکال دی تو واقعی دل سے اسے نبھا کر ہی چھوڑا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ انھوں نے عربی اور اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ مسرت کے لئے ایک انگریز مس بھی رکھی، جو اسے بے حد جانفشانی سے انگلش پڑھانے لگی۔ ساتھ ہی سیون، پرودن، بنٹنگ، پکوان، سلیقہ قرینہ غرض کوئی ایسی بات نہ چھوٹی جس کا بڑی بیگم نے بطور خاص خیال نہ رکھا ہو۔ مسرت ابھی آٹھ نو سال کی ہی ہوگی کہ اس نے خود بھی بڑی بیگم کی محبت کو پرکھ لیا۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی موقع پر کوئی نہ کوئی تو پوچھ ہی لیتا۔

"اے ہے بڑی بیگم آپ تو بچی کے پیچھے جان تباہ کئے دے رہی ہیں"۔

تب وہ مسرت کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتیں۔ "یہ تو میری بیٹی ہے اور یہ تو سوچو یتیم یسیر ہے اسی کے طفیل تو مجھے جنت ملے گی۔"

انھیں دنوں رمضان کے مبارک مہینے کی بات ہے۔ شہر سے ایک مولانا صاحب بطور خاص تراویح کی نمازیں پڑھانے کے لئے گاؤں بلوائے گئے مہینے بھر تک انھوں نے ہر کس و ناکس کے منہ سے یہی بات سنی کہ بڑی بیگم کس قدر خدا پرست ہیں۔ کس طرح غریبوں کے لئے ان کی تجوری کا منہ کھلا ہوا ہے کیسے کیسے انھوں نے اپنی تمام تر زندگی انھیں لوگوں کے لئے وقف کر رکھی ہے

جو مصیبت کے مارے ہیں اور یہ کہ ایک یتیم اور یسیر لڑکی کو کس طرح جگر کا ٹکڑا بنا رکھا ہے۔

مہینے کے ختم پر جب وہ واپس شہر جانے لگے تو پردے کی آڑ سے بڑی بیگم سے بات چیت ہوئی انھوں نے بغیر کسی قسم کی خوشامد اور چاپلوسی کے واقعی سچائی سے کہا۔

"بیگم صاحبہ آپ یہ سب کچھ جو کر رہی ہیں۔ خدا کے یہاں آپ کی نجات ہی نجات ہے۔"

بڑی بیگم کی تشکر سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔ "مولانا صاحب بس یہی دعا ہے کہ خدا عافیت بخیر کرے۔ دنیا کے مزے تو چکھ لئے، اب آخرت کی دھن ہے۔"

"ارے یہ آپ کیا کہتی ہیں، آپ کچھ نہ کرتیں، لیکن صرف ایک یتیم یسیر لڑکی کو پال کر ہی آپ نے وہ کچھ کیا ہے کہ جس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔"

بڑی بیگم نے تڑپ کر بات کاٹی۔ "مولانا صاحب! اسے یتیم لڑکی کے نام سے نہ پکاریئے۔ میری بیٹی ہے وہ۔ اسے اسی طرح مخاطب کیجئے جیسے وہ۔ ....." ان کی آواز بھوٹ بہی۔

"مرحبا، مرحبا"، مولانا صاحب بے اختیار ہو کر پکار اٹھے۔ "مبارک ہیں آپ، مبارک ہیں وہ در و دیوار جن کی پناہ میں آپ رہتی ہیں۔ مبارک ہے وہ زمین جس پر آپ قدم دھرتی ہیں آپ کی جگہ برحق ہے، جنت میں آپ کا مقام بلند ہے۔" اور وہ اللہ ہو، اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس دن سے بڑی بیگم پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل گئے ۔ ان کی محنت خدا نے سہل کردی ۔ اتنے بڑے مولانا فرما گئے کہ جنت برحق ہے تو یقینی ہوگی ۔ اور یہ سب نیک اعمال کا نتیجہ ہے، یہ اعمال مسرّت کے قدموں کے طفیل ہیں۔ وہ اسے جی جان سے نہارنے لگیں ۔

صالحہ ان کی بڑی بیٹی سال کے سال ماں کے یہاں گرمیاں گزارنے اور آم کھانے آتی تھیں ۔ ماں نے مسرّت کو گود لیا تبھی سے وہ کھٹکیں ۔ لیکن منہ سے کچھ بول نہ پاتی تھیں ۔ جانتی تھیں کہ ماں نے زندگی بھر ہر طرح کے دکھ سہے ۔ اب بڑھاپے میں دل بہلانے کی خاطر یہ سہارے پال رکھے ہیں اور ان کی برابری کا کوئی جوڑی دار ہوتا تو شائد طوفان اٹھا لیتا ۔ مگر جانتی تھیں کہ جتنے ہیں، سب ایسے ویسے ہیں ۔ کسی کے ماں باپ نے غربت کے ناطے لاکر گود میں ڈال دیا ہے ۔ کوئی حرام کا تھا تو کوئی کوڑے کھدرے سے برآمد کیا ہوا ۔ کوئی بھٹکتا بھٹکا تا آکر گلے پڑ گیا ہے ۔ لیکن مسرّت کو جس چاؤ چونچلے سے لیا تھا وہ دل برا کر دینے کے لئے بہت کافی تھا ۔ مگر ٹال گئیں ۔ ہر برس آتیں اور رجدا رنگ دیکھ کر جاتیں ۔ ماں نے جب اعلان کیا تھا کہ مسرت ان کی بیٹی ہے تو ان کا ماتھا ٹھنکا ۔ اب تو یقینًا جائیداد کی وارث ٹھہری ۔ مگر ماں کے آگے بھلا بول ہی کیا سکتی تھیں ۔ لیکن اس سال تو پیمانہ ہی چھلک گیا بڑی بیگم کی زندگی کا رخ ہی مولانا صاحب نے پھیر دیا ۔ جب سے انھوں نے اتنے پہنچے ہوئے بزرگ کے منہ سے یہ بات سن لی تھی کہ وہ جنت کی واقعی مستحق ہیں ۔ ان کی محبت مسرّت سے کچھ زیادہ ہی سوا ہو گئی تھی ۔ حد یہ رہی کہ انھوں نے اپنے مہر میں ملنے والی تمام جائیداد بھی مسرّت کے نام جیتے جی لکھ دی ۔۔۔ جو

کم وبیش سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی بنتی تھی - یہ وار ایسا نہ تھا کہ بیٹی چین سے سہار جاتیں - بھئی ظاہر ہے کہ ان کے بیچ میں یہ نصیبوں جلی مسرت نہ ٹپک جاتی تو یہ انھیں کا تو حق تھا نا - بڑے دبدھے سے ماں سے کہا -

"اماں بیگم، آپ نے بغیر سوچے سمجھے اتنی بڑی جائداد مسرت کے نام کر دی -"

بڑی بیگم بے حد مطمئن انداز سے مسکرائیں "تو کیا ہوا بیٹی تمہارے جہیز میں بھی تو کم وبیش ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ کا زیور کپڑا گیا ہے - وہ بھی تو میری ہی بیٹی ہے -"

رُکتے رکتے صالحہ بولیں - "مگر اماں بیگم گود لی ہوئی اور سگی اولاد میں کچھ تو فرق رکھتیں آپ - کیا سچ مچ وہ میری برابری کر سکتی ہے - اور کیا سچ مچ آپ، اُسے مجھ سے زیادہ چاہ سکتی ہیں -"

اسی لمحے مسرت کسی کام سے ادھر آ نکلی - لمحہ بھر تو صالحہ بھی اسے دیکھ کر بات کرنی بھول گئیں - غضب خدا کا، کیا رنگ وروپ پایا تھا، کیا دبدبہ کیسی شان - کیسی پاکیزگی، برس رہی تھی صورت پر - سچ ہے خدا حسن کی دولت جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے - اس میں غریب امیر کی تخصیص نہیں رکھتا - بڑے بڑے پائنچوں کے گلابی غرارے، گلابی فراک، اور ہلکے سبز دوپٹے میں کیسی نکھر رہی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ انگ انگ چوم لیں -

بڑی بیگم ان کی بات کا جواب دے رہی تھیں - بیٹا، محبت، نفرت کا کیا ذکر ہے - محبت تو جانور کو پالو تو اس سے بھی ہو جاتی ہے - اور دل پھر جائے تو سگی اولاد کی طرف دیکھنے تک کو جی نہیں چاہتا - مسرت کی

بات ہی اور ہے میں نے اسے جی جان کا ٹکڑا بنا کر پالا ہے۔ سچ کہتی ہوں اتنی محبت اور توجہ میں نے تم دونوں بہن بھائی پر بھی نہیں صرف کی تھی، مجھے سچ مچ اس کی اتنی ہی محبت آتی ہے۔ جتنی تم دونوں کی۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم سے بھی زیادہ۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ یتیم ولیسیر ہے۔ اسے میں نے جتنی محبت دی ہے۔ اس کے صلے میں مجھے اتنی ہی نیکیاں ملیں گی۔ وہ میری بیٹی بھی ہے، میری عاقبت، میری نجات اور میری جنت کا راستہ بھی۔"

مسرّت نے ایک ٹک رک کر یہ ساری باتیں سنیں۔ اس نے پہلے بڑی بیگم کی طرف دیکھا پھر صالحہ کی طرف، منہ سے کچھ نہیں بولی۔

صالحہ بیگم بھی چپ رہ گئیں، بات آئی گئی ہو گئی۔

چند سال اور گذرے، مسرت نے شہر جا کر میٹرک کا امتحان بھی دیا۔ اور پاس بھی ہوئی۔ اب بڑی بیگم کو اس کے مستقبل کی، شادی کی فکر تھی۔ لیکن خود مسرّت چاہتی تھی کہ ابھی کچھ اور پڑھ لے۔ زمانہ آگے بڑھ رہا تھا وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ ایک دن بڑی بیگم کے سامنے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ حیران حیران سی بولیں۔

"بیٹی تجھے کمانے دھمانے کی کون حاجت ہے۔ میں نے تیرے نام اتنی اُتنی نہیں ڈیڑھ لاکھ کی جائیداد کر دی ہے۔ کچھ نہ کرے، اگر صرف بینک میں ہی رقم رکھی رہے تو ہر ماہ چھ سات سو روپے آجائیں۔ کیا اتنے میں تیری گذر بسر نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں امی، ایسی کوئی بات نہیں۔" مسرّت بے لبسی سے بولی ۔۔ "آپ سمجھتی نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو اور کیا مطلب تھا؟" بڑی بیگم ذرا بناوٹی غصے سے بولیں۔ "کیا تو مجھے ماں نہیں سمجھتی؟"

مسرت نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ "امی خدا کے لئے ایسا نہ سوچئے میں نے کب کہا، آپ میری ماں نہیں ہیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز سے بولی۔ "خدا کے بعد جو کچھ ہیں آپ ہی تو ہیں میرے لئے اور کون ہے۔۔۔"

آگے اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ رو پڑی، اس کے ساتھ بڑی بیگم بھی رو پڑیں۔ مسرت سچ مچ ان کی جان و ایمان بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ پاتیں۔ جبکہ اس کے چہرے پر غم کی ہلکی سی چھاپ بھی انھیں ملول کر دیتی۔ وہ اس کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں، غموں اور خوشیوں، اس کے اندھیروں اور اجالوں کی سبھی چیزوں کی وہی ذمہ دار تھیں یہ ناممکن تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسرت کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا اور اسے ایک بول بھی بول سکتا۔ بیٹے سے تو اسی مارے مدت ہوئی بول چال بند ہو چکی تھی۔ جب سے کہ انھوں نے جائداد کا وارث مسرت کو قرار دیا تھا صالحہ بھی بگڑیں بہت مگر قدرتی بات ہے کہ بٹیاں ماں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں اس لئے وہ ماں سے ٹوٹ تو نہ سکیں البتہ شیشے میں بال ضرور پڑ گیا۔ مگر یہ کوئی بات ایسی نہ تھی جس کی وجہ سے بڑی بیگم بد دل ہو کر بیٹھے بیٹی کی بات مان جاتیں۔ وہ جس مقصد کو لے کر چلی تھیں وہ مقصد وہ راہ سیدھی جنت تک پہنچتی تھی۔

مسرت خوبصورت تھی، جوان تھی، تعلیم یافتہ تھی اور پیسے والی تھی۔

جب یہ ساری خوبیاں ایک جگہ جمع ہوں تو پیام یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے آندھی پانی سے کچی امیاں ٹپاٹپ گرتی ہیں ۔ قریبی لوگوں کو معلوم بھی تھا کہ مسرّت بڑی بیگم کی اپنی سگی بیٹی نہیں ۔ مگر ڈیڑھ دو لاکھ کی جائیداد نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ پیام لانے والوں میں وہ بھی تھے جنھوں نے بیگم کے اس اقدام پر ناک بھوں چڑھائی تھی، کہ اور کچھ نہیں سوجھا تو غلام زادے کی یتیم یسر لڑکی ہی کو بیٹی بنا ڈالا اور وہ بھی جو اس نیک قدم کو جی جان سے سراہتے تھے اور چاہتے تھے کہ واقعی اس بے مثال ہیرے کی جوت انہی کے مقدر کی جوت بن جائے ۔

بڑی چھان بین کے بعد آخر کار بڑی بیگم نے ایک خاندانی لڑکا پسند کر ہی لیا ۔ لڑکا بیحد قابل، بے حد سوجھ بوجھ والا تھا، سول انجنیئر تھا۔ گھر کا بھی کھاتا پیتا تھا اور تنخواہ بھی آٹھ سو تھی ۔ زیادہ زر، زیور، دولت کا بڑی بیگم کو لالچ تھی نہ خواہش ، خدا کا دیا ان کی مسرّت کے پاس اتنا کچھ موجود تھا کہ زندگی بھر چاہتی تو چار کو کھلا کر خود کھا سکتی تھی ۔ وہ صرف شرافت پر جان دیتی تھیں ۔ سو خدا نے ان کی سن لی ۔

جہیز کا جوڑ جماؤ شروع ہوا تو بس یوں لگتا تھا کہ گھر میں دکانیں کھل گئی ہیں حویلی کتنی بڑی تھی ، اس کمرے میں کپڑے سل رہے ہیں اس کمرے میں جوڑوں پر گوٹا کناری ٹک رہا ہے ۔ اس کمرے میں سونار بیٹھا ٹھک ٹھک کر رہا ہے۔ اس کمرے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہے ۔ تو اس کمرے میں تیار زیورات کی جانچ ہو رہی ہے ۔ رقعے چھپے اور مقررہ تاریخ پر لوگ باگ آنے شروع ہوئے۔ ان میں جلنے والے بھی تھے اور بڑے خوش ہونے والے بھی ۔ مسرت مایوں منجے بیٹھ چکی تھی ، سنہری

لباس میں اس کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ بڑی بیگم کے پاس پہنچ کر گفتگو کا بس ایک ہی موضوع باقی رہ جاتا۔ "بڑی بیگم آپ نے تو واقعی حد کر دی، کیا دل پایا ہے کہ بس واہ۔" بڑی بیگم مطمئن لہجے میں بڑے انکسار سے کہتیں۔" میں نے کیا کیا ہے بی بی، سب حوصلہ خدا کا دیا ہوا تھا ورنہ میں کیا کر سکتی تھی۔ بس خدا نے سُن لی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اور بس پھر میں اللہ اللہ کروں۔ سوائے عاقبت کے اب کوئی فکر نہیں۔"

کہنے والیاں ہاں میں ہاں ملاتیں۔" اور کیا اب آپ نے اتنا بڑا ایثار کیا ہے تو خدا کے یہاں جنت تو آپ کی ہی منتظر ہے بس۔"

"ہاں بی بی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے تین لڑکیوں کو پال پوس کر جوان کیا اور بیاہ دیا وہ جنت کا مستحق ہو گیا۔ یہ میرے ہاتھوں کی رہی لڑکی بیاہی جا رہی ہے۔ صرف جنت کی اور خدا کی خوشنودی کی آس ہے ورنہ اب دنیا میں رہ گیا ہے۔"

بازو کے کمرے میں مسرت بیٹھی سنتی رہتی، بیٹھے بیٹھے آپی آپ اس کی سسکیاں اُبھرنے لگتیں، کون جانے میکہ چھوٹنے پر یہ آنسو بہتے تھے یا اور کوئی غم اسے کھائے جا رہا تھا۔

اگلا دن عقد خوانی کا تھا۔ ایک دن پہلے مہندی ہوئی تھی ہرے ہرے لباس میں مسرت کومل ڈالی کی طرح جھکی جا رہی تھی مہین پلو میں سے عارض کی تابانی جھلکتی تو کچھ یوں لگتا کہ سورج ابھی ادھر ہی سے طلوع ہو گا۔

مہمان بیبیاں کھچاکھچ بھری ہوئی تھیں۔ وہ دھوم دھڑاکا تھا کہ کان پھٹ کر رہ جائیں۔ زنانے مردانے دونوں جگہ غضب کا ہجوم تھا۔ لوگوں کا

اندازہ تھا، کہ دان جہیز کو تو چھوڑو، صرف بارات اور مہمانوں کا اوپر کا خرچ ہی کوئی تیس چالیس ہزار کا پڑ جائے گا۔ کل کا دن تو بڑے ہنگامے کا ہوگا، اس خیال سے حویلی میں آج سے جہیز جمنا شروع کر دیا گیا۔ بھر بھر کمرے جہیز سے اٹے پڑے تھے۔ بڑے وسیع ہال میں جگ مگ کرتی، کار، ریڈیو سیٹ گراموفون، فرج، ریڈیوگرام، صوفہ سیٹ، ڈبل بیڈ، کیا کیا نہ تھا۔ بس حویلی کیا تھی کسی شوروم کا روپ ہو کر رہ گئی تھی۔

بڑی بیگم مسرت کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آتیں اور وہ آنسو پی پی جاتیں۔ کل مسرت پرائی ہو جائے گی۔ کتنی مصیبتوں سے پالا، کتنی محبت اسے دی سب چیز سے منہ موڑ کر سارے بندھن توڑ کر وہ بڑی بیگم کو اکیلی چھوڑ کر چلی جائے گی، جھر جھر بہتے آنسوؤں کو اب انھوں نے روکنے کی کوشش کی بھی نہیں۔ اسی دن کے لئے تو وہ آس مند تھیں۔ صرف اسی دن کے لئے اتنی ساری کٹھنائیوں کو وہ شربت جان کر پی گئی تھیں کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے آخر کو یتیم یسیر تھی۔ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو ساری دنیا مل کر ان کے منہ پر کالک تھوپ گدھے پر بٹھوا دیتی۔ کل اس کے وداع ہوتے ہی ان کی نامکمل جنت میں آخری اینٹ بھی رکھ دی جائے گی۔ اور وہ اپنے خدا کے آگے سرخرو ہو سکیں گی۔

بڑی بیگم اپنے خیالات سے چونکیں جب ممانی جان نے ان کا شانہ، تھپ تھپا کر کہا۔

"مبارک ہو بہن! خدا نے تمہاری دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اس سے زیادہ ایک ماں کی تمنا اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"ہاں بی بی "۔ بڑی بیگم اور کچھ نہ کہہ سکیں۔ بھر بھر آنے والے آنسوؤں نے ان کا گلا دبوچ لیا۔ مہمان بیبیوں میں سے کوئی بولیں۔

مگر بڑی بیگم آپ پر واقعی کمال حیرت ہے۔ آپ نے کس طرح بیس برسوں تک اپنے وجود کو بھلا کر بالکل نوکر بن کر بٹیا کی خدمت کی ہے۔ کبھی دیکھنے والوں کو ایسا لگا ہی نہیں کہ یہ آپ کی سگی بٹیا نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ بڑی بیگم تڑپ کر بولیں۔" ایسا نہ کہیئے، ایسا نہ سوچئے وہ میری سگی بیٹی ہی ہے۔ بلکہ سگی سے بھی بڑھ کر ہے اسے منزل تک پہنچا کر ہیں خود بھی تو جنت کی اہل ......"

بات ابھی بڑی بیگم کے منہ میں ہی تھی کہ مسرت کی کانپتی ہوئی آواز پوری طاقت کے ساتھ کمرے میں ابھری۔" میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں بڑی بیگم میں آپ کی بیٹی نہیں۔ بیس برسوں سے اس جملے کو سنتے سنتے خدا گواہ ہے میرے کان پک گئے، میں جانتی ہوں میں آپ کی بیٹی نہیں صرف وہ راہ ہوں جس پر چل کر آپ جنت تک جا سکیں۔ آپ نے زندگی میں کبھی مجھے ماں کی محبت نہیں دی، کبھی باپ کا پیار نہیں دیا۔

___ کبھی مجھے اولاد نہ جانا۔ جانا تو بس یہ جانا کہ میں ایک سہارا ہوں آپ کی جنت کے حصول کا۔ آپ کی دولت، عزت، جائیداد، دان، دہیز یہ سب فریب ہے۔ دکھاوا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ اصلیت صرف یہ ہے کہ آپ کو جنت چاہیئے تھی جو آپ نے میرے خون کے بدلے واقعی حاصل کر لی۔"

بڑی بیگم نے گھبرا کر دیکھا۔" مسرت یہ کیا کہہ رہی ہے، کیا ہو گیا ہے

تجھے، تو ہوش میں ہے یا نہیں ۔ لوگ کیا سوچیں گے ۔ کیا کہیں گے بیٹی ذرا ہوش کی لے ۔"

"میں ہوش میں ہوں، پورے ہوش میں ۔ بیس برس سے میں ہوش ہی میں تو ہوں ۔ لیکن آج میں اپنے ہر نفس کو بھول جانا چاہتی ہوں ۔ لیکن ایک دعا کرتی جاؤں گی کہ خدا آپ کو واقعی جنت دے ۔ بیس برسوں تک آپ نے جس خلوص اور جس چاہت سے جنت کی آرزو کی ہے، اگر خدا نے نہ دی تو اس جیسا ناانصاف کوئی نہیں ۔"

بڑی بیگم اسے سنبھالنے کو لپکیں مگر وہ سب سے بلند اور اونچی ٹیک پر سے نیچے چھلانگ لگا چکی تھی ۔ انھوں نے ہولا کر نیچے جھانکا ۔ جیتے جیتے سرخ سرخ خون کی ندی سی بہہ نکلی تھی، ان کی قطعاً سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ندی جنت کو جارہی ہے یا دوزخ کو !

ساحل اور طوفان

"اُف میرا دم نکلا جارہا ہے۔" زہرہ بدحواس کچن سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی اور گھبرا کر بولی۔ "ہوا کیا۔؟"

رفیق صاحب برہمی سے بولے۔" ابھی اور پوچھنا باقی ہے کہ ہوا کیا۔ محترمہ بھوک سے میرا دم نکلا جارہا ہے۔ ادھر آفس کا ٹائم بھی ہوگیا ہے۔ اور آپ ہیں کہ...."

زہرہ ناگواری سے بولی۔ "لیکن ایسا بھی کیا چلاّنا کہ دوسروں کے ہاتھ پاؤں ہی پھول جائیں۔"

رفیق صاحب نے ذرا بھنّا کر بیوی کو دیکھا بولے۔" میں چلاّتا ہوں؟ یعنی کہ فضول ہی چلاّتا ہوں نا؟ اور خود ذرا یہ نہیں سوچتیں کہ آخر میرا کون سا کام وقت پر ہوتا ہے۔"

زہرہ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو چھلک آئے ۔ آپ کا یہی مطلب ہے نا کہ میں پھوہڑ ہوں، بد سلیقہ ہوں ۔ کچھ کرتی کراتی نہیں، دن بھر آرام سے پلنگ توڑتی پڑی رہتی ہوں .....“

رفیق بے چارے اس بے موسم کی برسات سے قدرے بد حواس ہو گئے ۔ یہ رونا دھونا کس بات پر بھئی ۔ ایک تو غلطی اوپر سے ہمیں ڈراتی بھی ہیں ۔“

”جی ہاں ۔ میں تو ہوں ہی ایسی ۔ آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے ۔ جو آپ کو بے حد آرام دے، بے حد خیال رکھے ۔“

”تو آپ سمجھتی ہیں کہ ایک شادی سے مجھے سبق نہیں ملا جو دوسری بار بھی پھانسی پر چڑھ جاؤں .....“

یہ وار زہرہ سے برداشت نہ ہو سکا ۔ ”پھانسی ؟ آپ اتنی پیاری زندگی کو پھانسی کہتے ہیں کون سی نعمت اور راحت ہے جو آپ کو اس گھر میں میسر نہیں ۔ اور اور .....“ وہ سسکیوں کے درمیان پھانسی کی گردان کرنے لگی ۔ آپ سا ناشکرا شائد ہی اتنی بڑی دنیا میں کوئی ہو۔“

یہ وار رفیق کی برداشت سے باہر تھا ۔ تنک کر بولا ۔” میں ناشکرا ہوں؟ یعنی کہ مجھے اس گھر میں ہر نعمت اور راحت میسر ہے ۔ اور پھر بھی پاگل ہوں جو چڑتا پھرتا ہوں ۔ مجال ہے جو آفس جانے اٹھوں اور کوئی چیز جگہ پر مل جائے ٹائی جوتوں کے اندر ملتی ہے ۔ موزے ہینگر پر ۔ شرٹ مسہری کے نیچے پتلون میز پر، پن کی کیپ غائب ہے ۔ تو کبھی میرا فائل کچن سے دستیاب ہو رہا ہے چلو بھئی اتنا سب کر کرا کے کھانے پر بیٹھو تو .....“ انھوں نے

قدرے ڈر کر ترچھی نگاہوں سے زہرہ کو دیکھا اور جملہ ہی ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں ہاں کہئے نا، رک کیوں گئے ۔ اب کھانے میں عیب نکالئے۔"

وہ اک دم تیکھی ہو گئیں، کمر پر ہاتھ رکھ کر بے حد غصّے سے بولی۔

"حضور چار چار بچّوں کی ماں اور آپ جیسے شوہر کی بیوی ہو کر جو اتنا کر لے وہی غنیمت سمجھئیے ۔ آپ کو پتہ بھی ہے دن بھر کیا کیا گزرتی ہے مجھ پر؟"

رفیق صاحب پہلوانوں کے سے انداز میں میدان میں کودے۔

"اچھا محترمہ یہ بتائیے کہ آپ دن بھر کیا کرتی ہیں ؟" زہرہ اس درجہ حقارت سے ہنسی کہ رفیق کا پارہ انتہائی ڈگری پر پہنچ گیا۔

جو بھی کرتی ہوں آپ اگر ایک بھی دن کر کے بتا دیں تو ساری زندگی غلامی میں بِتا دوں ۔"

"اچھا ؟" رفیق صاحب بناوٹی حیرت سے بولے ۔" یہ ارادے ہیں آپ کے! محترمہ سے کچھ ہوتا ہواتا نہیں، اور خواہ مخواہ بے کے بے چارے بچوں کو بدنام کرتی پھرتی ہیں۔ بندہ یوں چٹکی بجاتے میں سارے کام سنبھال لے۔ اور پھر خالی کا خالی، ـــ"

"رفیق صاحب" زہرہ متانت سے بولی" ساحل سے کبھی اندازہ طوفاں نہیں ہوتا ۔ اس سمندر میں بس ایک غوطہ ہی لگانا کافی ہے۔"

"اچھا ۔" رفیق صاحب ذرا تن کر بولے ۔ اتنا مشکل کام ہے گھر داری ـــ ؟ ۔

"جی ہاں آفس میں بیٹھ کر قلم چلانا اور بات ہے اور دن بھر گھر رہ کر چولھا چکی سنبھالنا، بچوں سے، نوکر سے نپٹنا اور میاں کی برابری کرنا قطعاً

اور ـــ یہ آپ سوچ سکتے بھی نہیں تو کریں گے کیسے ۔ ؟"

" اچھا ۔ ؟ " رفیق تنک گئے ۔ یہ سراسر ان کی مردانگی کو چیلنج تھا ۔ " میں سوچ بھی نہیں سکتا ۔"

" جی ہاں ـــ " زہرہ تھکن سے بھاری آواز میں بولی ۔ بہت مشکل ہے ۔ بہت مشکل ہے ۔ پھر اتنا بڑا اسٹیٹ سنبھال کر ہر کام نبھانا تو اور مصیبت ہے ۔"

" اچھا ـــ ذرا آپ اپنے کاموں کی فہرست تو سنائیے تاکہ ہمیں بھی پتہ چلے کہ آپ کتنے پانی میں ہیں ۔"

" زہرہ جل گئی ـــ " کیوں آپ صبح سے شام تک مجھے گھانی کے بیل کی طرح جتا ہوا نہیں دیکھتے جو یہ سوال کر رہے ہیں ۔ پھر بھی آپ کو یقین نہیں آتا تو سنیئے ۔ صبح اُٹھ کر سب سے پہلے چار بچوں کا مونھ دھلانا اور نہلانا ، بڑے دو بچوں کو اسکول بھجوانا ، پھر ناشتہ لگوانا ، بچوں کی بس جلدی سے آگئی تو ناشتہ ساتھ ہی کر دینا ۔ پھر کھانا ساتھ بھجوانا ۔ پھر آپ کا ٹفن بھجوانا ـــ تین بجے مارکٹنگ کو جانا ۔ (یہاں پہنچ کر رفیق صاحب دیدے پٹ پٹانے لگے ۔) واپسی پر چائے تیار کرنا ـــ اتنے میں بچوں کی واپسی کا وقت ہو جاتا ہے ۔ ان کے لئے ہلکا ناشتہ تیار کرنا ۔ سب بچوں کو تیار کر کے پارک بھجوانا ، (رفیق صاحب نے بے ہوش نہ ہونے کی کوشش میں طنزیہ مسکرانا شروع کر دیا ۔) پھر شام کو خانساماں کو رات کے کھانے کے لئے ہدایت دینا .. پھر . . . . "

یہاں رفیق صاحب اُبل پڑے " کیا پھر پھر لگا رکھی ہے محترمہ

کیا مجھے پتہ نہیں کہ آخر گھر میں کیا کیا کام ہو سکتے ہیں ۔ چلئے ایک ہفتے کے لئے گھر کا سارا انتظام ہمارے ذمّے ۔

"اور آفس ۔ ؟ زہرہ شرارت سے بولی ۔

"ایک ہفتہ کی چھٹی رکھی ہوئی تھی اسے نکال لیں گے۔" وہ بالکل یقین سے بولے

"مگر مجھے شک ہے ۔" زہرہ ہنس کر بولی ۔

"کیسا شک ۔"

"کہ آپ گھرداری ہفتہ تو خیر بڑی بات ہے، ایک دن بھی سنبھال نہ سکیں گے ۔" ۔ ہوگا دراصل یہ کہ آپ چھٹی تو ہفتہ بھر کی ضرور نکال لیں گے۔ لیکن ایک دن کام کرکے آپ اتنے تھک جائیں گے۔ کہ باقی کے سات دن صرف آرام کرنے میں گزار دیں گے۔"

"دیکھو جولی تم مجھے بن بات غصہ مت دلاؤ اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو اہمیت مت دو ۔ کل کا دن گزر جانے دو ۔ تمہاری اہمیت خود تم پر ظاہر ہو جائے گی ۔ اور پھر زندگی بھر مجھ سے منہ چھپاتی پھرو گی ۔"

زہرہ نے اتنا زوردار قہقہہ لگایا کہ رفیق صاحب بیٹھے بیٹھے ڈر سے گئے دوسرے لمحے بیحد غصہ سے بولے ۔

"اچھا یہ بات ہے نا ؟ کل سے آپ دن بھر اپنے کمرے میں آرام فرماتی رہیئے ۔ ویسے بھی آپ کا نواں ماہ چل رہا ہے ۔ آرام کی ضرورت ہے ۔ بندہ سب کچھ نپٹ لے گا ۔"

زہرہ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولی "جیسی حضور کی مرضی ۔"

رفیق صاحب کو دن چڑھے سو کر اٹھنے کی عادت تھی۔ سوچا پتہ نہیں آنکھ کھلے یا نہ کھلے۔ بہتر ہے الارم لگا کر ہی سوئیں۔ صبح ہی صبح ٹرن۔ ٹرن کی کرخت آواز نے ان کی نیند تباہ کردی۔ اور ساتھ ہی موڈ بھی۔ ابھی زہرہ کے نام سے چلانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ خیال آیا کہ آج تو شرط کا دن ہے۔ پہلا دن اور یہ کہ میٹھی نیند توڑ کر خود انھیں ہی جگنا ہے۔ اور بیوی بچوں کے ناشتہ پانی کا بندوبست کرنا ہے۔ رضائی کو ایک لات ماری اور اللہ کا نام لے کر اٹھ بیٹھے

"مم۔ ممی دو۔ دو۔"

ارے یہ صبح ہی صبح دو دو کی طلب کیسے آن پڑی۔" سر گھما کر دیکھا تو سب سے ننھی بچی دودھ کے لئے رو رہی تھی۔ خیر جب اوکھلی میں سر ڈال ہی دیا تھا تو موسلوں کی کون گنتی۔؟ اٹھے اور سیدھے کچن میں دوڑے دیکھا تو دودھ ہی غائب۔ خانساماں بیٹھا اونگھ رہا تھا پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ تو ابھی ابھی کام پر آیا ہے۔" دودھ والا سبیرے سبیرے پانچ بجے ہی بوتلیں دے جاتا ہے جو میم صاحب ہی اٹھ کر لیتی ہیں آپ جانیں ہم تو ابھی آئے ہیں۔" پتہ چلا کہ چونکہ زہرہ کو ہر کام سے منع کر چکے تھے۔ اس لئے اس نے بھی دودھ نہ لیا۔ دودھ والا دروازہ پیٹ پیٹ کر یونہی واپس چلا گیا۔ ناچار خانساماں کو دودھ کے لئے پیسے دے کر بھجوانا پڑا۔ اس عرصے میں ننھی سنگیت میں نئے نئے اضافے کرتی رہی کہ ایک بار تو میاں تان سین بھی ہوتے تو پیچھے پڑ جاتے۔ دودھ آیا۔ یہ غنیمت تھا کہ زہرہ گیس کا چولھا استعمال کرتی تھی ایک سکنڈ میں چولھا جل گیا۔ دودھ کو ابال لیا۔ یونہی بوتل میں بھرا۔ تڑ سے بوتل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ خانساماں نے بیٹھے بیٹھے چترائی جتائی

"صاب آپ نے ٹھنڈا تو کیا ہوتا ۔ گرم چیز سے کانچ کیسے نہ چٹخے گا ۔ ؟"

خانساماں کو پھر سے بوتل کے لئے دوڑایا گیا ۔ بڑی مشکل سے نپل ٹھونس ٹھونس کر جو ننھی کو دودھ پلانے بیٹھے ہیں تو ایک گھونٹ بھر کر ہی منہ پھیر لیا ۔ اور وہ رونا شروع کیا کہ رفیق صاحب کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ۔

"صاحب آپ نے شکر چھوڑی تھی کہ نہیں ۔ ؟" خانساماں وہیں سے چلائے ۔ ان کے دم کو غنیمت سمجھ کر بھاگم بھاگ پھر الماری تک پہنچے ، شکر ملائی تب کہیں جاکر ننھی چپ ہوئی ۔

اتنے میں دوسرے تین بچے اٹھ چکے تھے اور اپنے اپنے بستروں پر منتظر تھے کہ ممّی آئے اور چمکار کر انھیں اٹھائے ۔ مگر آج تو ممّی کا دور دور تک پتہ نہ تھا ۔ پپّا آئے ، اجنبیوں کی طرح گھور گھور کر دیکھا اور تربیت کرنے والے انداز میں بولے ۔

"کیوں بچّو منہ نہیں دھلے گا آج ۔ ؟"

بے بی منمنائی ۔ "وہ تو ممّی دھلاتی ہیں ۔ ہمارے ہاتھ سے برش چبھ جاتا ہے نا تو دانتوں سے پون (خون) نکلتا ہے ۔"

تو مطلب یہ کہ تین تین بچوں کا منہ دھلانا ابھی باقی ہے ۔ انھوں نے پھر ہمّت کسی ۔ "تو آؤ آج ہم دھلادیں ۔ تمہاری ممّی کی طبیعت آج خراب ہے ۔"

گھسّے مار کر جو منہ دھلایا تو تینوں نے کورس شروع کر دیا ۔ بہر حال نہلانے کا مسئلہ باقی ہی تھا ۔ لیکن اس میں انھیں کوئی تکلیف نہ دکھائی دی

— لیا اور سب بچوں کو ایک سرے سے ٹھنڈے پانی کے شاور کے نیچے کھڑا کر دیا — سردی کے مارے بچوں کے مونہہ ہاتھ نیلے پڑ گئے۔ تب انھیں خیال آیا کہ سردی کا موسم ہے اور یہ کہ ٹھنڈے پانی سے نہلانا خطرے کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ تو تولیوں میں لپیٹ کر ایک ایک کو اٹھایا۔ ساری کسر کپڑے پہنانے میں نکل گئی — ایک کو بنیان پہناتے تو دوسرا جب تک شرٹ اتار پھینکتا — ایک کو شرٹ پہناتے تو تب تک دوسرا چڈی اتار پھینکتا — پوڈر سے وہ بے تحاشا ہولی کھیلی گئی کہ نیا ڈبہ منٹوں میں خالی ہو گیا۔ اور نیچے قالین پر پوڈر کا بستر بچھ گیا۔ اس دوران مسلسل بچوں کا رونا جاری رہا اور رفیق صاحب کن انکھیوں سے رہ رہ کر زہرہ کے کمرہ کی طرف دیکھتے رہے کہ کہیں وہ جھانک تو نہیں رہی ہے — ؟ اور اگر جھانک رہی ہے تو چہرے پر طنز کی چھاپ تو نہیں ہے — ؟

اتنے میں زور زور سے بس کا ہارن بجنا شروع ہو گیا۔ بچوں کی اسکول بس آ گئی — اور گھبرا گھبرا کر خانساماں سے کہہ رہے تھے۔" ارے بھئی بچوں کا ناشتہ لاؤ نا — ساتھ جائے گا —" خانساماں مزے میں بیڑی دھونکتے بیٹھے تھے۔ وہیں سے لاپروائی سے بولے۔" ہم ناشتہ کہاں سے لادیں۔ آپ نے کچھ آرڈر دیا ہی نہیں تو اپنے دل سے ہی پکا لیتے۔؟ میم صاب روزانہ کہہ دیتی ہیں کہ یہ پکاؤ تو ہم تیار کر دیتے ہیں۔ ہم ٹھیرے نوکر دل کی مرجی کیسے چلائیں۔"

خانساماں کا اتنا لمبا مکالمہ سنتے سنتے ان کا دل باہر نکل کر پھڑپھڑانے لگا۔ بہر حال بچوں کو ایک ایک روپیہ تھما دیا۔ جسے پاتے ہی ان کے دلوں سے

ناشتہ نہ ملنے کا ملال یکسر مٹ گیا۔ اور اُچھلتے کودتے دونوں اسکول چلے گئے ۔ ایک لمحے کے لئے انھوں نے اطمینان کی سانس لی ۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا اور کونہ سنبھالتے ہوئے ذرا کی ذرا آرام کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا سامنے ندی بہہ رہی ہے۔ ندی کے ساتھ ساتھ آنکھ جو اٹھتی گئی تو پتہ چلا کہ اس ندی کے منبع ننھے میاں ہیں۔ جو گیلی چڈی میں سکڑے کھڑے ہیں خانساماں کو بلا کر فرش صاف کرنے کو کہا تو وہ تنک مزاجی سے بولے ۔" جی ہم کوئی ڈآیا تھوڑی ہیں جو پیشاب صاف کرتے پھریں گے" انھیں کچن میں دفعان ہونے کا حکم دے کر سارا فرش خود ہی ہانپ ہانپ کر صاف کیا۔ صابن سے ہاتھ دھو کر بڑے کمرے میں آئے اور گھڑی پر نظر کی تو پتہ چلا کہ ساڑھے آٹھ تو ہو گئے مگر اب تک خود ان کا منہ دھلا ہے نہ بیگم صاحبہ کو چائے ہی بھجوا سکے ہیں ۔ جب کہ زہرہ اس وقت تک ناشتہ بھی کروا چکی ہوتی ۔ یہ اور بات تھی کہ خود ہی دن چڑھے تک اینڈتے سوتے پڑے رہیں دونوں بڑے بچوں کو رشوت دے کر بہلا چکے تھے ۔ چھوٹی دودھ پی کر بڑے سے بھلے سے بہر حال مطمئن ہو چکی تھی۔ مگر ننھے میاں کے ناشتے کا ملول ہنوز باقی تھا۔ اور پھر دھیرے دھیرے اور پھر زور زور سے تھانہ تھانہ کر کے رونے لگے تھے ۔ کچن پہنچ کر ٹٹولنا شروع کر دیا ۔ پھر خود ہی خیال آیا کہ خانساماں کو پیسے تو دیئے ہی نہیں ۔ جب تک خانساماں انڈے اور ڈبل روٹی لائے انھوں نے خود ہی الٹا سیدھا برش مل کر منہ دھونے کی تہمت خود پر لگالی ۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا ۔ انڈا تل کر اب لاتا ہے نہ جب ۔ چڑ کر آواز

دی تو وہ سعادت مندی سے بولے۔ "اب صاب ہم کیا جانیں آپ پھرائیڈا انڈا چاہتے ہیں یا خاگینہ۔ میم صاحب تو ہمیں....."

رفیق صاحب نے لال لال دیدوں سے گھور کر انھیں دیکھا اور بھنا کر بولے۔

"آپ مہربانی فرما کر سب ہی انڈوں کو پھرائی کر کے لے آئیے۔"

ٹیبل پر چند جلے ہوئے انڈے اور لجلجے ٹوسٹ تھے۔ خانساماں کے بلانے پر زہرہ آئی اور مہمان کی طرح بیٹھ گئی۔ پہلے ٹیبل کو دیکھا اور پھر میاں کو ۔۔۔ ایک نگاہ جو بظاہر کچھ نہ تھی مگر سب کچھ تھی۔ رفیق صاحب جل کر رہ گئے۔ مگر کچھ نہ کہہ سکے۔ کہتے تو اپنی رسوائی تھی۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے تھے۔ اور پہاڑ جیسا دن بھی باقی تھا۔

آج اننا دن چڑھ گیا تھا۔ اور انھیں اخبار دیکھنے تک کی مہلت نہ ملی تھی جب کہ روزانہ اس وقت تک وہ ایک ایک حرف چاٹ جایا کرتے تھے۔ ابھی اخبار کا پہلا صفحہ کھڑکھڑانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ پرلے کمرے سے ننھی اور منے کی بے پناہ چیخوں کی آواز نے انھیں دہلا دیا۔ پہنچے تو پتہ چلا کہ ان کی آفس کی جو بے حد ضروری فائل تھی۔ خود انھوں نے ہی غلطی سے نیچی ٹیبل پر رکھ دی تھی اور لڑائی اس بات پر ہو رہی تھی کہ انتہائی ضروری اور اہم کاغذات کو پھاڑ پھاڑ کر صرف اکیلا منّا ہی کشتیاں بنا رہا تھا۔ اور ننھی کو اس میں کسی قسم کی پارٹنر شپ دینے کو تیار نہ تھا۔ رفیق صاحب سر پکڑ کر رہ گئے۔ بڑی مشکل سے چند دھپے جڑ کر دونوں کے ہاتھ سے کاغذات چھینے اور پسینہ پونچھتے اور کن انکھیوں سے زہرہ کے کمرے کی طرف دیکھتے

ہوئے ورانڈے میں یوں آ بیٹھے جیسے بڑی بھاری کشتی ہار کر آئے ہوں
اب جو انھوں نے سر اٹھا کر غور سے دیکھا تو یہ احساس ہوا کہ گھر انتہائی
گندہ پڑا ہوا ہے۔ اور یہ کہ جھاڑو لگانے کا انتہائی اہم فریضہ بھی انہی کو ادا کرنا
ہے۔ اپنی بے پناہ توند کی بیچارگی کا خیال کر کے انھیں زہرہ پر غصہ آ گیا
"ررکنجوس کہیں کی ۔۔ ایک نوکر اوپر کے کام اور بچوں کے لئے نہیں رکھ سکتیں
یہ بھی کوئی تک ہے کہ صبح سے لے کر شام تک سارے کام خود ہی انسان نبٹاتا
پھرے ۔۔ ؟" بہرحال جھاڑنا تو تھا الٹے سیدھے ہاتھ جو مارنے شروع
کئے تو بعد میں اطمینان سے بیٹھ کر حساب جوڑا تو ایک گل دان ۔ دونوں
ایش ٹرے ۔۔ شادی کی فوٹو والا فریم اور تین گلاس جو ایک ہی ساتھ
دھرے ہوئے تھے شہید ہو چکے تھے ۔۔ سردی کے دن ہوتے ہوئے بھی
مارے پسینے اور گرمی کے دم نکلا جا رہا تھا ۔۔ سیدھے باتھنگ گاؤن
اٹھا کر باتھ روم میں گھس پڑے۔ ڈھیروں پانی انڈیلنے کے بعد باہر آئے
تو اس قدر سکون ملا کہ آرام کرسی پر پڑتے ہی ڈھیر ہو گئے ۔۔ جب آنکھ کھلی
تو ڈیڑھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ بہت خوش ہوئے کہ چلو اتنی دیر تو آرام و اطمینان
سے وقت کٹ گیا۔ خانساماں کو کھانا لگانے کے لئے آواز دی تو وہ شکایتوں
کا دفتر لئے موجود ہو گئے۔

"جنے آج کیا ہو رہا ہے۔ صاحب آپ نے ہمیں پیسہ دیا نہیں۔ سودا
بتایا نہیں۔ ہم کیا پکاتے ۔۔ ؟ اوپر سے آج برتن دھونے والی بائی بھی
نہیں آئی۔ ایسے دنوں میں تو میم صاحب خود برتن وغیرہ دھونے میں
ہمارا ہاتھ بٹایا کرتی ہیں ۔"

"اتنا کہہ کر وہ چپ رہ گئے مطلب صاف تھا کہ صاب اتنے کام چور ثابت ہوئے کہ برتن تک نہیں دھوئے۔

رفیق صاحب کا بس نہ چلا کہ اس چرہے کے بچے کو باہر اٹھا کر پھینک دیں پھر یہ سوچ کر غصہ ضبط کیا کہ ایک سے دو بھلے۔ کم سے کم باہر سے سودا سلف لانے کی تو آسانی رہے گی۔ جھک مار کر پیسے دیئے۔ صدیوں بعد خانساماں پلٹے تو بکساں موہنہ ہی موہنہ میں میم صاحب کا وظیفہ پڑھتے ہوئے جس کا خلاصہ تھا کہ جلدی کے موقعوں پر میم صاحب خود ہی پکانے بیٹھ جاتی ہیں اور یہ حقیقت بھی تھی کہ خانساماں لے دے کے صرف چاول پکا دیتے اور روٹیاں تھوپ دیتے۔ لیکن مہنگائی کے اس دور میں زہرہ انہی کو غنیمت جان کر نبھا رہی تھی - باقی کا ہر کام وہ ان کے ساتھ مل کر آدھے سے زیادہ کر لیتی۔ اسی لئے "وہ" میم صاحب "سے اس درجہ خوش بھی تھے۔ اب انھوں نے جو ٹیک جھٹک شروع کی ہے کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔ انھوں نے میم صاحب کو آئے دن کھڑے مصالحے کا کچا سالن پکاتے دیکھا جس کا نام تو کچا سالن ہوتا مگر اتنا لذیذ ہوتا کہ کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ اور یہ ڈش زہرہ ہمیشہ جلدی کے موقعوں پر تیار کرتی تھی اب انھوں نے بیگم صاحبہ کی تقلید میں گوشت میں کچی پیاز، کچی ادرک، کچا لہسن ثابت ہری کالی مرچیں اور گھی نمک ڈال کر اوپر سے ڈھکنا لگا کر چولہے پر چڑھا دیا۔ اور مزے سے اجمیر والے کھاجا بگڑی ہماری بنا دے (خانساماں خود کو سدا جمع کے صیغے میں مخاطب کرتے لفظ "میں" ان کی لغت میں حرام تھا) گاتے ہوئے چاول بیننے بیٹھ گئے۔ چند ہی منٹوں میں انھوں نے انتہائی

پھرتی سے چولہے کے دوسرے حصے پر چاول پکاکر رکھ دیئے اور اپنی آسانی کی خاطر بولے ۔" صاحب دیر بہت ہو چکی تھی ۔ اس لئے ہم دوپہر کے لیے بھی بریڈ ہی لے آئے ہیں ۔ کچے کُورمے (قورمے) سے بہت مجادے گی چلئے کھانا تیار ہے ۔"

ادہر سے زہرہ ادھر سے رفیق صاحب ، جب ٹیبل پر پہنچے تو خیر زہرہ کے تو پورے دن تھے ۔ اُسے ابکائی آنا ایسی کوئی انہونی بات نہ تھی لیکن رفیق صاحب کو قے ہوتے ہوتے بچی ۔ سالن میں سوائے سالن کے ہر قسم کی جاں فزا "خوشبو" آرہی تھی ۔ اور بہت ایسی تھی کہ پیاز، لہسن ادرک، مرچیں ہر چیز اپنے اصلی روپ میں تیر رہی تھی اور عجیب وغریب بھبکے اٹھ رہے تھے ۔ رفیق صاحب نے ایک ضروری کام یاد کرتے ہوئے کہا " میں ابھی آیا جولی تم شروع کردو ۔" اور اپنے کمرے میں بھاگ کر پناہ لی ۔

جولی نے گھڑی پر نظر کی ۔ ڈھائی بجے تھے ۔ میز پر نظر کی ۔ اور اس نے سوچا کہ آج سے پہلے کبھی تین سالنوں سے کم سے میز نہ سجی تھی اور وہ بھی انگریزوں کی طرح ٹائم کی پابندی سے ۔ یعنی ٹھیک ایک بجے ۔ ایک پیاری سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اُبھر آئی ۔ ساڑھے تین کے قریب بچے اسکول سے واپس آئے اور آتے ہی ممی کی گردن سے جھول گئے ۔

" ممی آپ نے آج ہمیں کھانا بھی نہیں بھجوایا ۔"

ممی پیار سے ان کے گال تھپ تھپا کر بولی ۔" بیٹے ہم نے آپ سے

کہا نہیں تھا کہ آج ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آج کے دن آپ لوگوں کا ہر کام پپا ہی کریں گے۔" وہ انھیں پپا کے کمرے کی طرف بھجواتی ہوئی بولی۔ "جاؤ پپا سے کہو ہمارے کپڑے بدلوا کر ہمیں ناشتہ دیجئے تاکہ ہم پارک میں کھیلنے جا سکیں۔ اور ہاں دودھ پینا نہ بھولنا۔

رفیق صاحب پر اس وقت ایک ناگہانی مصیبت آپڑی تھی ہوا یہ تھا کہ دوپہر کو بقول خانساماں کے کیامت (قیامت) کی گڑبڑ میں ہم اپنی انگلی کاٹ بیٹھے ہیں۔ اب ہم سے پیاز نہیں کاٹی جاتی۔ ذرا آپ ہی اتی پیاز کے چھلکے اتار دینا۔" اور اتنی نہ اتنی پوری کلو بھر پیاز انھوں نے مع ایک خوفناک چھری کے رفیق صاحب کے سامنے لاکر لوٹ دی رفیق صاحب نے پہلے تو دیدے پٹ پٹا کر دیکھا کہ آفس میں کام کرنے والے سات سو روپے ماہانہ کمانے والے ایک گزٹیڈ آفیسر کا کیا یہ بھی کام ہو سکتا ہے۔؟ لیکن جب پھر سے انھیں وظیفہ سننے کو ملا کہ" میم صاحب تو ایسے تکلیف کے دنوں میں ہماری بہت مدد کرتی ہیں۔"

تو وہ تن تنا کر پیاز کاٹنے پر تل ہی گئے۔ پیاز تو خیر کیا کٹتی ہاں دو انگلیاں ضرور کٹ گئیں۔ تلملا کر جو ٹنکچر آئیوڈین لگانے اپنے کمرے میں بھاگے۔ تو وہاں پتہ چلا کہ آ گے ہی بچوں نے ڈسپنسری قائم کر رکھی ہے وکس، ٹنکچر آ۔ ایسپرو۔ مرہم۔ آیوڈکس۔ کف مکسچر۔ اور گھر میں جو بھی ضروری دوائیں رہتی ہیں۔ سب کو دکان کی طرح سجا کر بڑے صاحبزادے ڈاکٹر بنے بیٹھے ہیں۔ اور روبی صاحبہ ان کے نرس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اور مریض بنے ہیں منا اور ننھی۔ جن کو زبردستی کف مکسچر

بلایا جا رہا ہے۔ اور وہ چیخیں بلند ہو رہی ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ !!

انھوں نے لرز کر سوچا "خدا نہ کرے بجائے کھانسی کے مکسچر کے یہ ایک دوسرے کو ٹنکچر پلا دیتے تو۔ ؟ کیا مصیبت ہے خدا کی قسم یہ گھر داری۔ اور یہ بچے اور یہ خانہ داری — انھوں نے بہ آواز بلند چڑنا چاہا مگر غیرت آڑے آ گئی۔

بچوں نے بجائے ڈرنے یا سہمنے کے اُلٹا انھیں لتاڑنا شروع کر دیا "پپا آپ نے ہمیں ناشتہ بھی نہ کروایا — کھانا بھی نہ بھجوایا — اور جو روز ممّی کے بجائے آپ ہی ہمارا کام کریں تو ہم تو مر ہی جائیں —

بات جتنی کڑوی تھی اتنی ہی سچ بھی — کیا کہتے —؟ کیا کرتے جھینپ مٹانے کو بولے —" ارے بیٹے روز روز تھوڑی ہی ایسے ہوگا۔ اب کل سے دیکھنا ذرا — ہم خود تمہیں اسکول سے واپسی پر شاپنگ کو بھی لے جائیں گے۔ اور پتہ ہے کیا کیا دلائیں گے اپنے بچوں کو —؟ وہ پرچانے والے لہجے میں بولے۔ ببلون — چاکلیٹ ٹافی پنسلیں رنگین والی۔ اور جناب کھلونے اور ڈھیر سارا سامان —" بچے حیرت سے مونہہ کھولے سنتے رہے۔ اور وہ اس موقع کا ناجائز فائدہ اٹھا کر بولے — " تو بس ذرا جھٹ پٹ کپڑے تو بدل ڈالو بچو"۔

مگر بڑے صاحبزادے شرماتے ہوئے بولے "پپا ہمیں نیکر کے بٹن لگانے نہیں آتے — ہمیں تو ممّی ہی کپڑے پہناتی ہیں —"

جھک مار کر پپا ہی کو کپڑے بدلوانے پڑے۔ ناشتے کا مرحلہ

یوں طے ہوا کہ اتفاقاً انھیں ریک کے اوپر پڑا ہوا بسکٹ کا ایک ڈبہ دوپہر میں نظر آگیا تھا، وہ انھوں نے بچوں کو پکڑا دیا۔ دودھ کے لئے خانساماں کی مدد ڈھونڈی تو اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جی وہ ہم گلتی (غلطی) سے دودھ بوتلوں سے نکالنا بھول گئے وہ یونہی دھوپ میں پڑی رہیں۔ بعد کو گرم کیا تو سب پھٹ گیا۔ اب ہم صاب لوگ کا نکسان ہوتے تو دیکھ سکتے نہیں، سو ہم نے اس میں تھوڑی سی شکر چھوڑ دی، اور اس کا میٹھا بنا کر کھا گئے۔"

اس کے بعد تو چڑنے چڑانے کا سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ مگر شام کی چائے کا مرحلہ جو باقی تھا۔ اس کے لئے دودھ ہر حال میں منگانا ہی تھا ناچار روپیہ دے کر مارکیٹ کو دوڑایا۔

ان میں بار بار زہرہ سے سامنا کرنے کی تاب نہ تھی۔ اس لئے بہت سلیقے کا مظاہرہ کر کے انھوں نے چائے ٹی سیٹ میں اسی کے کمرے میں بھجوادی۔ بڑے بچوں کے حوالے چھوٹے بچوں کو کیا اور سیر کرنے پارک بھجوادیا — اب جو گھر میں ایک دم سکون ہو گیا۔ تو یہ لمحات انھیں بڑے غنیمت لگے۔ ابھی اطمینان اور سکون کا مزہ لوٹنے کی خاطر انھوں نے آنکھ بند ہی کی تھی کہ پھر خانساماں وارد ہو گئے۔

صاب آج صبح اور دوپہر میں تو آپ کی وجہ سے سارا کام چوپٹ ہو گیا۔ (رفیق صاحب اس صاف گوئی پر دنگ رہ گئے۔) لائیے شام کے لئے ابھی سے پیسے دیجئے ورنہ پھر ٹیم پر کھانا نہیں پکے گا۔ تو نیچے تماشا کریں گے۔"

خانساماں کی اس ہمدردی سے رفیق صاحب بے حد خوش ہوگئے کہ انھیں بچوں کا کتنا خیال ہے۔ دو روپے دیئے تو کہنے لگے ۔" ارے واہ صاحب ایک دن میم صاب کا جی اچھا نہیں تو جرا تو ڈھنگ کا پکوان کھلائیں ۔ ہم تو شام کے لئے مرگ (مرغ) پکانے کا سوچ رہے تھے۔ دو روپے میں بھلا کون مرگ بیچے گا ۔ ؟"

رفیق صاحب نے بھی سوچا ٹھیک ہے۔ دن بھر کی جان لیوا تھکان اور کام کے بعد رات کا کھانا شاندار ہو جائے تو کیا ہی کہنے ! انھوں نے پانچ کا نوٹ اور عنایت کر دیا۔ دہی اور مصالحوں کے لئے دو روپے خانساماں نے آگے ہی اپنی میلی سی جیب میں رکھ لئے تھے ۔ اس وقت تک مغرب کا ٹائم ہو چکا تھا۔ بچے پارک سے کھیل کود کر لوٹ آئے تھے اور کھانا مانگ مانگ کر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف کر رہے تھے کہ آج صبح سے بے چاروں کو ایک سرے سے کھانا ملا ہی نہیں۔

رفیق صاحب نے چاہا کہانی سنا کر ان کا دل بہلائیں مگر سب صاف اڑ گئے کہ کہانی تو ممی ہمیں روزانہ سوتے وقت سناتی ہیں ۔ آپ تو ابھی سے سنانے لگے ۔ ابھی تو ہم نے کھانا بھی نہیں کھایا ۔ رفیق صاحب بار بار باورچی خانے کی طرف جھانکتے مگر وہاں تو اُلّو بول رہا تھا۔ اس آس میں کہ شاید کچن میں کوئی کھانے کی ایسی چیز مل جائے ۔ جس سے وقتی طور پر بچوں کی بھوک مٹ جائے ۔ وہ گئے تو وہاں جھوٹے برتنوں، چائے کے کپوں، کچرے کے اور طرح طرح کے گندگی کے ڈھیر نظر آئے اور وہ الٹے پیروں پلٹ آئے ۔ سوچا کہ ذرا باہر نکل کر ہی خانساماں کی خبر لیں کہ آخر اتنی دیر

سے کہاں مرگیا ہے۔ اتفاقاً بازو والے ڈاکٹر صاحب کا نوکر سودا لے کر واپس
آرہا تھا۔ اس نے اطلاعاً عرض کیا۔

"جی آپ کا خانساماں تو سینما کی لائن میں ٹکٹ کے لئے
کھڑا ہے"۔ اچانک انھیں یاد آیا کہ زہرہ ہمیشہ بتایا کرتی تھی کہ خانساماں کے
ہاتھ میں جہاں زیادہ پیسے دئے کہ سیدھے وحیدہ رحمان کے دیدار کو پہنچ جاتے
ہیں اور ٹوکو تو کافی چڑ کر کہتے ہیں۔

"اب آپ چاہتی ہیں کہ ہم دو گھڑی اپنا جی بھی نہ بہلائیں۔ مینا کماری
کا پھلم تو پھیر بہت آتی ہے مگر وحیدہ رحمان کی کیا بات ہے۔ برسوں میں
آتی ہے ہم اپنے من کو کیسے مار سکتے ہیں۔ ہاں روپیہ آپ شوق سے
ہماری پگار میں سے کاٹ لیں۔"

دراصل ایمانداری کا ہی وہ جذبہ تھا جس کی بنا پر جولی خانساماں
کو نبھائے جارہی تھی کہ وقتی طور پر پیسے لے کر بھاگ ضرور جاتے
مگر بعد میں آکر خود ہی حساب بتا دیتے اور کہتے کہ "ہماری پگار میں سے
کاٹ لیجئے"۔

خانساماں کو روتے ہوئے، رفیق صاحب گھر میں آئے۔
نقشہ ہی اور تھا، بڑے بچوں نے چھوٹے بچوں کی دلبستگی کی خاطر ہر قسم کا
اٹمبر سامان باہر لا ڈالا تھا۔ اس میں کپ طشتریوں، بچوں کے جھنجھنوں سے
لیکر فرج میں کے نکالے ہوئے آلو، بینگن، کٹی ہوئی ادھ کٹی ہوئی پیاز، چاقو
چھری، پپّا کے کاغذات، جوتے، ٹائیاں، پن، اور بھی کئی قسم کا الّم
غلّم شامل تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ بچے آخر بچے ہی تھے کتنے بڑے

کیوں نہ ہوتے۔ پہلے تو دو بڑوں نے چھوٹوں کو بہلانے کی کوشش کی، لیکن لیکن آخر کار چاروں مل کر کورس میں رونے لگے، اس میں پپا کی نا اہلی کی شکایت بھی ہو رہی تھی۔ ممی سے بھوک کی پکار بھی اور ہر قسم کی فرمائشیں بھی۔ اور باورچی خانے کا بھی یہ عالم تھا کہ برسوں وہاں سے کھانا پکانے کی خوشبو نہ آپائے گی۔

رفیق صاحب نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اور رہ رہ کر زہرہ کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک دم زہرہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ ایک لمحے کو دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اُف جولی کی وہ نگاہیں ان میں غصہ تھا نہ شکایت۔ کوئی طعنہ تھا نہ الاہنا۔ بلکہ رحم بھرا پیار تھا۔ نگاہیں جو بے زبانی سے کہہ رہی تھیں " میں تمہیں کوئی طعنہ نہیں دوں گی۔ میرے گڈو کیوں کر میں جانتی ہوں کہ تمہارا میدان اور ہے میرا اور۔"

رفیق صاحب کا دل ایک لمحے کو چاہا کہ اپنی زیادتی کا اعتراف کر ہی لیں لیکن مرد کی فطری ہٹ ان کے آڑے آگئی۔ انھوں نے دھڑا کے سے اُٹھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر ہو کر کمرہ مقفل کر لیا۔

درخت اور پھل

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے جلتا چراغ بجھ کر رہ گیا
خالدہ جو ابھی ابھی بڑی خوش دلی سے ہنس رہی تھی۔ ایک دم پریشان سی ہو کر رہ گئی ۔ مگر اسلم کا تو جیسے دل ہی بجھ کر رہ گیا۔ وہ تلخی سے بولا۔

" خالدہ اسی لئے بڑے بوڑھے کہا کرتے ہیں کہ ہمیشہ زبان سے اچھی بات نکالنی چاہیئے ۔ تمہاری بات کے ساتھ ہی چراغ بجھ جانے کا شگون کوئی اچھی علامت ہے ؟"

" چلو ہٹو جی ۔" خالدہ ٹالنے کے انداز میں بولی "یوں چھوٹی چھوٹی باتوں کا چراغوں کے جلنے بجھنے سے شگون لیتے رہیں ۔ تو بس ہو چکی زندگی ۔

میں نے بھلا کہا ہی کیا تھا ایسا۔ یہی نا کہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اب کی بار زچگی میں میں زندہ نہ بچوں گی۔" وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگی، "اور تم جو مجھے میکے لینے آؤ گے تو بجائے اس کے کہ ہم چاروں خوش خوش لوٹیں۔ تمہیں دو بچوں کو لے کر اکیلے ہی لوٹنا پڑے گا اب اگر میں ایسا کہہ بھی دوں تو کیا برا ہے۔ ؟ زچگی عورت کا نیا جنم تو ہوتی ہی ہے۔ میرے خیال سے دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی عورت ہوتی ہوگی، جسے زچگی میں اپنے مرنے کا وہم نہ ستاتا ہو۔" وہ بن کر ہنسنے لگی آخر میں بھی تو عورت ہوں نا۔"

مگر تم یہ سوچو خالدہ کہ تمہاری اس قسم کی باتوں سے میرے دل کا چین اڑ جاتا ہے۔ میں دن بھر آفس کے کام سے تھکا ماندہ آتا ہوں، کہ منی اور تمہاری صورت دیکھ کر کھل اٹھوں لیکن جب تم اس قسم کی بات کر دیتی ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اندر ہی اندر بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔ یوں بظاہر زندہ نظر آ رہا ہوں۔"

خالدہ مسکرائی۔ "یہ بات کی بات ہے اسلم، لیکن سچ ذرا سوچو تو سہی کہ واقعی ایسا ہو گیا تو تم کیا کرو گے۔؟" دوسری شادی کر لو گے ؟ پھر میرے بچوں کا کیا بنے گا ؟" اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ "میں آج ہی سے اجازت دے دیتی ہوں اسلم کہ میرے بعد تم دوسری شادی کر لینا۔ تنہا نہ رہنا۔ واقعی سچ کہہ رہی ہوں۔ زندگی کی راہیں اتنی لمبی ہوتی ہیں اور سفر تنہا نہیں بیتایا جا سکتا۔ مگر میرے بچوں کو اپنی اماں یا میری اماں کے حوالے کر دینا کیوں کہ یہی دو ہستیاں ماں کے بعد ایسی ہوتی ہیں جو ماں کا سا پیار دے سکتی ہیں۔"

اسلم چلایا۔ "میں تمہارے بچّوں کو ندی میں پھینک دوں گا۔ سمجھیں اور خود عیش اڑاؤں گا۔" ایک دم وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر عورتوں کی طرح رو پڑا۔ "خالدہ! تم نہیں جانتیں میں تمہیں کس درجہ چاہتا ہوں۔ تم ایسی باتیں کر کے مجھے زندگی سے دور۔۔۔۔ کرنے کی کوشش کر رہی ہو میری جان۔ خدا کے لئے اب اس قسم کی بات نہ کرنا۔ تمہارے بغیر میری زندگی کا تصور ہی کیا ہے۔ میں تمہارے بغیر شائد ایک پل بھی زندہ نہ رہ سکوں۔ یہ دوسری شادی بیاہ کی کیا تک ہے۔" ایک دم وہ اسے چڑانے کو بولا۔

"اچھا فرض کرو میں کسی دن آفس سے آتے ہوئے بس یا لاری سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاؤں تو تم بڑے مزے سے دوسری شادی رچا لوگی اور ظاہر ہے دوسرے شوہر سے تمہارے جو بچے ہوں گے۔ وہ میرے بچوں سے بڑا تلخ برتاؤ کریں گے۔ کیوں کہ وہ تو باپ والے ہوں گے۔ اور یہ بیچارے یتیم پھر میری روح کیسے چین پا سکے گی۔؟

خالدہ اپنی بی۔اے کی ڈگری طاق میں رکھ کر خالص عورتوں کی طرح بولی۔" اگر تم اب منہ سے ایسی بد زبان نکالو گے تو خدا کرے میری میّت کو کندھا دو۔"

"ہاں ہاں۔" اسلم بچوں کی طرح اُچکا۔ "اپنا وقت آنا ہے تو خود کو سنے بیٹھ جاتی ہو اور میرے لئے تو تمہارا یہ خیال ہے کہ میرے سینے میں نہ تو دل ہی ہے اور نہ ہی میں تم سے محبت کرتا ہوں تم نے تو یہ سمجھ لیا کہ سیتا اور ساوتری کا سارا پتی ورتا پن تم میں ہی رچ

بس گیا ہے۔" وہ پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"اچھا اب اچھے بچوں کی طرح توبہ توبہ کر کے معافی مانگو کہ میں آئندہ سے ایسی بری بری باتیں نہ کروں گی۔"

مگر خالدہ یونہی بھٹس بنی رہی۔ وہ سخت غصّہ ہو رہی تھی۔

"اچھا تو اب آپ کا قصور ہوتے ہوئے بھی ہمیں معافی مانگنی پڑے گی۔۔؟"

"تو کیا میں مانگوں گی؟ تم نے ابھی کتنی ہی ایسی باتیں کہی ہیں کہ میرا جی جل کر رہ گیا ہے۔ اب میں کتنے دن کڑھتی رہوں گی۔ ویسے تو تم بڑی محبت جتاتے پھرتے ہو کہ ان دنوں میں تمہیں خوش رہنا چاہیئے خوب کھانا چاہیئے۔ بے فکر رہنا چاہیئے۔ اب تم ایسی بات کرو گے تو میں خاک خوش رہوں گی۔ دو نوالے بھی حلق سے اتر جائیں تو جانوں اور یہ کوئی بے فکر رہنے کے انداز ہیں۔؟"

اسلم محبت سے بولا۔" جانِ من، گلشن، چمن۔ یہ تو تم جانتی ہو کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ تم اس کا سوّاں حصّہ بھی مجھے نہیں چاہ سکتیں، بس اس سے ہی اندازہ لگالو کہ تمہاری اس قسم کی مایوس کرنے والی باتوں سے میرے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ جب ازل سے معبود نے تخلیق کا یہی سلسلہ قائم کر دیا ہے۔ تو کوئی ایسی بات نہیں کہ یوں آسانی سے موت آجایا کرے اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا کی ساری عورتیں زچگیوں میں ختم ہو چکی ہوتیں۔ بس یہ بات ہے کہ ذرا تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ تو چند ایسے ایسے پھول کیا بن تکلیف ہی کے ملجاتے ہیں؟"

اس نے سوئی ہوئی منی کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر تم پہلی بار کتنی نروس تھیں۔ اللہ کے فضل سے بتاؤ تو تمہیں کچھ بھی ہوا۔ اور اب تو تمہاری صحت بھی اچھی ہے اور ذرا عادی بھی ہو گئی ہو۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔"اچھا اب رات بہت جا چکی ہے۔ چلو سو جائیں۔ صبح پھر آفس جانا ہے۔ تم بھی بلیھٹی بلیھٹی بے آرام ہو رہی ہو۔ اس نے پیار سے اسے، اپنی طرف کھینچا۔

ان کی شادی کو ابھی چار پانچ سال ہی تو ہوئے تھے۔ شادی کے چند ہی ماہ بعد۔ خالدہ کس طرح بچے کے لئے تڑپنے لگی تھی۔ کبھی کبھی تو اسلم اس کی بے قراری دیکھ کر ہنس پڑتا۔ سوچتا واقعی عورت کی اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ماں بننا ہی رہی ہو گی۔ ورنہ خالدہ ابھی سے یوں بے قرار نہ ہو جاتی کہ ابھی تو ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی نہیں چھوٹا تھا۔ اتنے کم عرصے میں وہ بڑی مایوسی کی باتیں کرنے لگی تھی۔

"اسلم ایسا تو نہیں ہو گا کہ میں کبھی ماں بنوں گی ہی نہیں۔"

"اسلم کبھی یوں ہوا کہ خدا نے بچہ دیا ہی نہیں تو کیا تم دوسری شادی کر لو گے۔؟

"میری تو ساری سہیلیوں کو شادی کے پہلے دوسرے مہینے ہی متلی قے کے سلسلے شروع ہو گئے تھے۔ اور میں تو چھ مہینے گزرنے پر بھی جہاں کی وہاں ہی ہوں۔" وہ چھ مہینے کو یوں گردانتی جیسے چھ سال گزر چکے ہوں۔"

شائد خدا کو اس پر رحم آگیا تھا۔ اس بات کے چند ہی دنوں بعد خالدہ کو متلی اور گرانی کی شکایت شروع ہو گئی۔ جانے کتنے ارمانوں اور جتن سے اس نے آگے ہی ڈھیروں کپڑے سی ڈالے۔ اون کے انبار اردگرد لگا دیئے۔ جی متلا رہا ہے۔ چکر آ رہے ہیں۔ لیٹے رہنے کی طبیعت چاہتی ہے۔ مگر وہ سلائی پہ یوں جُتی رہتی مانو کل ہی زچگی ہو۔ مگر جب وہ شہر کی ماہر لیڈی ڈاکٹر کے پاس "چیک اپ" کے لئے گئی تو اس نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کا جگر سخت خراب ہو رہا ہے معدہ بھی برابر کام نہیں کر رہا ہے جس کی وجہ سے آپ کے ہاضمہ پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ اس لئے آپ کو کھانا ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا۔ اور نہ طبیعت چست معلوم ہوتی ہے۔ دواؤں اور انجکشنوں کے ایک لمبے چوڑے کورس کے ساتھ اس نے پھل اور پھلوں میں خاص طور پر پپیتے کے زیادہ استعمال پر زور دیا۔ خالدہ کا جی زندگی سے اس قدر اچاٹ ہوا کہ اس نے نہ تو انجکشن ہی لئے نہ ہی دوا استعمال کی اسلم مرمر کر خوشامدیں کرتا تو کبھی کبھار پھلوں کا رس البتہ پی لیتی۔ دن بدن وہ مرجھاتی گئی۔

اسلم سوچتا خدا کا یہ سب سے سنگین ظلم ہوگا کہ وہ خالدہ کی کوکھ ہری نہ کرے۔ پڑے پڑے وہ اس قدر حسرت سے کھلونوں کی طرف دیکھتی کہ خود اسلم کا جی دکھ جاتا۔ رات کو سوتے ہوئے بڑے دکھے ہوئے دل کے ساتھ وہ اپنے بستر کو دیکھتی اور بولتی۔

"اسلم کبھی تم نے زچہ خانے دیکھے ہیں۔ ماں کے بستر کے

ساتھ چھوٹا سا بستر کتنا پیارا لگتا ہے۔

"خدا نے آج تک شائد نوزائیدہ بچے سے زیادہ حسین اور خوشبودار کوئی چیز پیدا نہیں کی۔"

اسلم کو ابکائی سی آنے لگی۔ جس بدبو کو خالدہ خوشبو سے تعبیر کرتی ہے! وہ اس نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کے تازہ تازہ پیدا شدہ بچوں کے پاس بارہا سونگھی تھی اور لال لال بجلجے لوتھڑوں کو دیکھ کر اسے اس قدر متلی ہوئی تھی کہ کلیاں کر کے پان کھاتے ہی بن پڑی تھی۔ مگر عورت کی فطرت میں خداوند کریم نے کتنی نرمی کتنی بلندی کتنا بڑا پن بھر دیا ہے۔ کس طرح گندگیوں کو سینے سے لگا کر نازاں ہوتی ہے لیکن خدا اگر بے رحم ہوتا تو نسل آدم کی افزائش کیوں کر ہوتی۔

اس بار خالدہ کو اس زور شور سے قے متلی کا سلسلہ شروع ہوا کہ وہ عاجز ہو کر رہ گئی۔ ڈاکٹر کے ہاں جانے کی بھی اس نے قطعی ضرورت محسوس نہ کی اناج، پانی پھل پھلواری ہر چیز سے ہیک بیٹھ گئی۔ جانے کتنے دنوں کے فاقے اس پر ٹوٹ پڑے اور دیدوں میں دم کھیلنے لگا۔ تو گھبرا کر اسلم گھر ہی پر لیڈی ڈاکٹر کو بلا لایا۔

ڈاکٹر نے آ کر اسے بڑی تشویش بھری نگاہوں سے دیکھا اور اسلم سے دو منٹ کے لئے باہر جانے کی التجا کرتی ہوئی خالدہ سے مخاطب ہو گئی۔

"آپ کہاں تک پڑھی ہوئی ہیں بیگم صاحبہ؟"

"بی، اے۔" بڑی نحیف آواز میں خالدہ بولی

"حیرت ہے، آپ جیسی تعلیم یافتہ خواتین بھی اگر صحت کی طرف سے یوں غفلت برتنے لگیں"۔ اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے کسی ننّھے وجود کو ٹٹولتی رہیں۔ پھر وہ قدرے سختی سے بولی۔" یہ ٹھیک ہے کہ شروع کے دنوں میں کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن جبراً تھوڑا بہت کھانا ہی چاہیئے۔ اگر آپ یونہی لاپرواہی کرتی رہیں تو ایک کمزور سے بچے کو جنم دیں گی۔"

خالدہ پلنگ پر جھپٹ کر اٹھ بیٹھی۔" یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔ عموماً اکثر کیس یونہی بگڑ جاتے ہیں۔ خیر میں آپ کے شوہر سے بات کرلوں گی"۔ اور وہ ہاتھ دھونے کے لئے برآمدہ میں چلی گئی۔

زندگی کا یہ دور خالدہ کے لئے بہاروں کا خزانہ لے کر آیا۔ وہ کس قدر خوش تھی۔ لیکن اس کے وسوسوں سے بھرے دل نے پریشانی کے نئے سلسلے سوچ لئے۔

"اسلم کہیں میں زچگی میں مر تو نہ جاؤں گی؟"

"عین وقت پر یہ سن کر کہ "لڑکا ہوا ہے"۔ میرا خوشی سے دم تو نہ نکل جائے گا۔"

اسلم جتنا خوش تھا اس سے کہیں زیادہ فکرمند! خالدہ کی وہمی طبیعت نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

نو مہینے آخر بیت ہی گئے اور جب چیخوں کراہوں، اور کڑے دردوں کے ساتھ خالدہ نے بچی کو جنم دیا تو اسلم نے سکون کا سانس

لیا۔ اسلم کمرے میں داخل ہوا تو دواؤں کی بو نے اس کا استقبال کیا۔ پلنگ پر نحیف نزار خالدہ زمانے بھر کی خوشیاں اپنے چہرے پر سمیٹے بڑے ہی پرسکون اور مطمئن انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسلم نے پیار سے اس کے گال تھپتھپا کر کہا۔

"تمہیں کیسے کیسے وہم ستاتے تھے میری جان کہ تمہیں کچھ ہو جائے گا۔ دیکھ لیا نا خدا کتنا بڑا ہے ۔۔۔۔؟"

اس نے بڑی محبت سے بچی کی طرف دیکھا۔

"میں اس قدر خوش ہوں، خدا نے بالکل تمہاری طرح ننھی سی مورت پیدا کر دی۔"

خالدہ بڑے غرور سے ہنسی۔ پھر ذرا رک کر بولی۔

"لازماً تمہیں لڑکی ہونے سے زیادہ خوشی ہوئی ہو گی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ لڑکا ہوتا۔ تمہارا چھوٹا سا نمونہ۔"

"اگلے سال سہی۔" وہ بشاشت سے ہنس کر بولا۔ خالدہ سرخ پڑ گئی۔

اگلے سال تو نہیں۔ ہاں دو ڈھائی سال بعد خالدہ کو اسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ چیک اپ کے لئے گئی تو پتہ چلا کہ پھر سے ننھے منے کپڑے سینا ہے۔ اب کی اس کی متلی اور قے میں قدرے کمی تھی اور ان علامتوں کو دیکھ کر اس کی دو چار ملنے جلنے والیاں اور سہیلیوں نے بتایا تھا کہ اب کے اس کے ہاں گول مٹول سا لڑکا پیدا ہو گا۔ بڑی بوڑھیاں اس کی یہ تاویل پیش کرتی ہیں کہ لڑکی سدا ماں کو تکلیف

ہی دیتی آئی ہے۔ پیٹ میں رہتی ہے تو قے۔ متلی کے زوردار سلسلے چکر۔ کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ تو بوجھ ماں کے سینے پر آپڑتا ہے کہ لڑکی ہوئی ہے۔ یعنی ذمہ داریاں سر سے اونچی ہوئیں۔ بڑی ہوتی ہے تو تربیت کی دیکھ بھال کی جان لیوا ذمہ داریاں اور جب شادی کا وقت آتا ہے تو سب سے بڑا دکھ دے جاتی ہے کہ پالا پوسا اور دوسرے کے حوالے کر دیا۔ لڑکا شروع سے ہی اعلان کرتا ہوا آتا ہے کہ میں آرہا ہوں۔ میں جو تمہارے دکھوں کا مداوا ہوں۔ تمہارے برے دنوں کا ازالہ۔ تمہاری خوشیوں کا پیغامبر اور بڑھاپے میں تمہارے عیش و آرام کا سامان۔" کھانا پکانے والی ماما بولی۔

"اے بی بی، یہ تو شروع دنوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بیٹا ہو گا بیٹے کا دم بڑا غنیمت ہے۔ کوئی تکلیف نہیں کوئی دکھ نہیں۔"

"تو بہر حال اب وہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن رہی ہے۔ اس نے بڑے مطمئن انداز سے سوچا۔ لیکن؟ اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟ کتنی خوشیاں اس کے ساتھ دفن ہو جائیں گی۔ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کے بعد تو ننھا منا سا خاندان جو چار افراد پر تھا۔ تکمیل کی حدوں کو پہنچتا ہے۔ اگر ایسے میں ماں ہی ختم ہو جائے؟"

وہ سر جھٹک جھٹک کر ان فاسد خیالات کو دماغ سے نکالنا چاہتی مگر برسات کے منہ زور بادلوں کی طرح اُمڈ اُمڈ کر خیالات گھرے چلے آتے۔

وہ اپنی ذہنی حالت کو اسلم سے بھی پوشیدہ نہ رکھ سکی۔ مگر وہ

اس کان سن کر اس کان اڑا دیتا اسے معلوم تھا کہ پہلی بار خالدہ نے اسے بھی پریشان کیا تھا اور خود بھی تباہ ہوئی تھی۔ اور آخر میں خدا نے جانوں کی سلامتی کے ساتھ گھر میں بہار بھر دی تھی۔ غصہ البتہ اسے بےحد آتا کہ خالدہ ایسی بے سر و پا باتیں سوچتی کیوں ہے۔ لیکن اپنے غصے کا کھلم کھلا اظہار اس نے کبھی نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایک تو خالدہ ویسے ہی حساس اور وہمی سی لڑکی ہے دوسرے عورت کو ان دنوں زیادہ سے زیادہ خوش رکھنا چاہیئے۔ اور یوں بھی وہ خالدہ کو جس طرح چاہتا تھا وہ چاہت عشق سے بڑھ کر جنون کی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ شاید ہی خالدہ کی آنکھ میں نمی بھی دیکھ پاتا اور ایسے میں وہ جب اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کی بات کرتی تو اس کا اپنا جی خالدہ سے پہلے مر جانے کو چاہتا اور اس دن خالدہ نے اس قدر بے ڈھنگی بات کی کہ وہ بری طرح جل گیا۔

"اسلم اب کی بار میں اپنے میکے میں زچگی کروانا چاہتی ہوں تاکہ اگر مر در گئی تو اپنے میکے والوں میں ہی مروں کم سے کم اماں آخری دیدار کو نہ ترسیں گی۔"

اسلم مارے غصے کے کچھ نہ بولا۔ خالدہ جو جی میں آیا بکتی رہی۔ اور یکبارگی یوں ہوا کہ جب اس نے اپنے مرنے کے تعلق سے ایک ہولناک سی بات کہی تو اسی دم ہوا کا ایک بیرحم جھونکا آیا اور دالان میں جگمگاتے چراغ کو بجھا گیا۔ اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ صبح سے لائٹ کا فیوز اڑا ہوا تھا اور انھوں نے گھر میں قندیل روشن کر رکھی تھی اور اسے بھی اسی لمحے بجھنا تھا۔؟ اس نے بچپن میں بڑی بوڑھیوں سے سن رکھا تھا کہ کئی بار ایسی باتوں پر چراغ

زور سے جگمگا اٹھتے ہیں، ابجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح شگون لیا جاتا ہے۔ اسلم کے دل میں گرہ پڑ گئی۔

خالدہ کے بے حد جان لیوا اصرار پر اسلم تین ماہ پہلے اسے اس کے میکے چھوڑ آیا۔ خالدہ نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ ظاہر ہے اتنی طویل مدت کے لئے اسے چھٹی نہیں مل سکتی۔ لیکن زچگی کے موقع پر وہ ضرور آئے اور خط لکھنے کا وعدہ بھی کیا اور لیا بھی۔ خالدہ کے خط پابندی سے آتے رہے اور وہ بھی روزانہ کبھی دن میں ایک بار، کبھی بہت تڑپ اٹھتا تو دن میں دو دو خط لکھتا۔ خالدہ کے خطوں میں کبھی خرابی طبیعت کی ہلکی سی شکایت رہتی کبھی یہ کہ پیروں پر ہلکی سی سوجن آگئی ہے۔ کبھی یہ کہ سانس بہت چڑھتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہنا نہ بھولتی کہ فکر نہ کرنا ویسے میری عام صحت تو اچھی ہے۔ ایسی تھوڑی بہت شکایتیں تو حمل کے دوران چلتی ہی رہتی ہیں۔ ڈاکٹرنی نے جو ٹائم بتایا تھا۔ اسلم اس کے ایک ہفتہ قبل ہی سسرال پہنچ گیا۔ اس نے خدا کا بیحد شکر ادا کیا کہ خالدہ بیحد صحت مند نظر آرہی تھی۔ بچی بھی مزوں میں تھی۔ ورنہ اتنے دنوں سے اس کے دل کا چین یوں اڑا تھا کہ اس کی اپنی صحت برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس رات جبکہ خالدہ کو زچگی کے درد اٹھے اور وہ ہاسپٹل ایڈمٹ کی گئی۔ اسلم کے لئے قیامت تھی۔ ہاسپٹل کے برآمدے میں رہ رہ کر اٹھتا بیٹھتا۔ چکر لگاتا، پھر بیٹھتا، نرسیں آتے جاتے اسے بڑی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹرنی سے اس نے بار بار اتنی دفعہ اس کی خیریت پوچھ ڈالی کہ وہ بھی بور ہو کر ہنس دی۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ درد آپ کو اٹھ رہے ہیں آپ کی مسز کو نہیں۔ آپ مطمئن رہیئے۔ آپ کی مسز کا بالکل نارمل کیس ہے۔ صبح ہوتے ہوتے آپ ایک لڑکے کے بھی باپ بن چکے ہوں گے۔ لڑکی کے باپ تو Already ہیں ہی۔" وہ ہنستی ہوئی ایڑیاں ٹپ ٹپاتی چلی گئی۔

یہ حقیقت تھی کہ صبح ہوتے ہوتے وہ ایک گول مٹول اور پیارے سے بیٹے کا باپ بن چکا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ایک زندگی کو جنم دیتے دیتے خالدہ خود اپنی زندگی کا چراغ بجھا بیٹھی تھی اس نے صرف اتنی ہی بات سنی تھی کہ خالدہ ختم ہو گئی۔ یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ کیسے ختم ہوئی؟ کیوں ختم ہوئی؟ وہ تو بے حد صحت مند تھی۔ اس کا کیس تو بالکل نارمل تھا۔ کیونکہ یہ خبر سنتے ہی وہ تیورا کر بے ہوش ہو کر جو گرا تو اسے اس لمحہ ہوش آیا تھا جب سرخ چادر اور پھولوں میں لپٹی لپٹائی دلہن۔ خالدہ کو آنگن میں جا جا کر سب دیکھ رہے تھے اور آنسو بھی پونچھ رہے تھے۔ اسے سب کچھ ناقابل یقین نظر آیا تھا۔ اور اسی لئے اسے رونا بھی نہ آیا۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور سوچنے لگا کہ بات کیا ہوئی۔ جب اس کے ذہن نے کسی طور حالات کو سمجھنا شروع کیا تو سب سے پہلے وہ اٹھا۔ بھاگتا ہوا کمرے میں گیا اور نوزائیدہ بچے کو اٹھا کر ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ یہی وہ قاتل تھا جس نے اس کی خالدہ کو ہمیشہ کے لئے اس سے جدا کر دیا تھا۔ پورے گھر میں کاؤں کاؤں مچ گئی۔ لوگ دلہن کو چھوڑ کر اسلم کی طرف بھاگے۔ اسے پکڑ کر بٹھایا۔ اس کے ہاتھوں سے بچے کو لیا

ساس پانی لے کر آگے بڑھیں

"بیٹا! یوں ہوش نہیں کھوتے۔ مجھے دیکھو میں ماں ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر غم کسے ہوگا۔ اس ننھی سی جان نے کیا بگاڑا ہے۔ یہ تو خدا کی مرضی تھی۔" بیچاری داماد کی خاطر اپنا غم بھول کر اسے سمجھا رہی تھیں۔ اسلم بہت متانت سے بولا۔

"آپ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں پاگل پن میں بچے کی طرف دوڑا ہوں۔ نہیں ایسی بات نہیں۔ میں خالدہ کے بنا اس بچے کو لے کر کر ہی کیا سکتا ہوں۔ اس کو لڑکے کا کس قدر ارمان تھا۔ اب وہ نہیں تو اسے بھی نہ رہنا چاہیئے۔"

کوئی نہ سمجھ سکا کہ واقعی اسلم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا یا ہوش میں۔ اس کی آنکھ میں ایک آنسو تک نہ تھا۔ چہرہ البتہ یوں کھنچ کر رہ گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسے مرے ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ وہ بیٹھا رہا ایک ٹک دیوار کو گھورتے گیا۔ آنگن میں رونے چیخنے کی آوازیں بلند ہوئیں تو بھی وہ نہ جاگا۔ خالدہ چلی گئی ہمیشہ کے لئے۔ مگر اس نے آخری بار اُسے کندھا نہ دیا۔ نہ ہی چہرہ دیکھا۔ اسے ایسے ہی بیٹھے بیٹھے جانے کتنے ہی قرن اور کتنی صدیاں بیت گئیں۔ بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں گئی تو اس نے بڑے اچنبھے سے دیکھا۔ دماغ پر زور ڈالا۔ تو اُسے یاد آیا کہ وہ کس ماحول میں ہے۔

"خالدہ کہتی تھی کہ میں مر جاؤں تو میرے بچوں کو اپنی اماں یا میری اماں کے پاس رہنے دینا۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جو ماں کے بعد ماں کا سا پیار

بچوں کو دے سکتی ہیں۔

"لیکن۔ بچوں کو اب پیار کی اور زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بچے میرے ہیں۔ حق میرا ہے ہیں جو چاہوں وہ سلوک ان کے ساتھ کروں۔"

وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اماں اب میں جاؤں گا۔ بچوں کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔" اس نے دو ٹوک فیصلہ یوں سنایا کہ بڑی بی گھبرا کر رہ گئیں۔

"اے بیٹا اتنی سی جان تم مرد ذات سے کیا پلے گی۔ ابھی چند روز میرے پاس رہنے دو۔ ہے تو تمہاری اولاد۔ پھر لے کر چلے جانا۔"

"اللہ بہت بڑا ہے اماں۔" وہ ذرا طنز سے بولا۔ پھر چند لمحے رکا۔ "ماما سنبھال لے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

ریل کھڑ کھڑ کرتی رہی۔ سفر طے ہوتا رہا۔ ایک دم پل کی دھڑ دھڑاہٹ ہوئی۔ اسلم کو یاد آیا کہ کس طرح ایک دن خالدہ کے چلّانے پر وہ بولا تھا۔

"ہاں ہاں تمہارے دونوں بچوں کو میں ندی میں پھینک دوں گا اور خود دوسری شادی رچالوں گا۔؟"

اس نے بڑی کراہت سے دونوں بچوں کی طرف دیکھا۔

"آپ بہت پریشان نظر آرہے ہیں صاحب کیا بات ہے۔؟"

بازو میں بیٹھے ہوئے ایک زمیندار قسم کے بھاری بھر کم آدمی نے اس سے بڑی ہمدردی سے سوال کیا۔

وہ بڑی دیر تک اجنبی اجنبی نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہا۔ پھر بڑی تھکی ہوئی آواز میں بولا۔

"ان بچوں کی ماں مرگئی ہے۔ اور اب میرا جی چاہتا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "ان دونوں کو اٹھا کر میں ندی میں پھینک دوں۔ مجھے اب ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔؟"

ان کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو چمک سی پیدا ہوئی۔ پھر متانت سے بولے۔

"اس وقت آپ پریشان بہت ہیں اس لئے ایسا سوچ رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں قطعاً پریشان نہیں ہوں۔ پورے ہوش میں ہوں۔" وہ واقعی اعتماد سے بولا۔ "اصل میں ان بچوں نے ہی مجھ سے میری خالدہ کو چھینا ہے۔ تو اب میرا دل چاہتا ہے کہ انھیں ٹھکانے لگا دوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان سے زندگی بھر محبت نہ کر سکوں گا۔ اور خاص طور سے اس زہریلے کیڑے سے۔" اس نے نفرت سے چھوٹے بچے کو دیکھا۔

"اگر آپ واقعی ہوش میں ہیں اور سچ کہہ رہے ہیں تو پھر آپ یہ بچے مجھے کیوں نہ دے دیں۔ میری بہت ساری زمین، کھیتی باڑی اور جائیداد ہے۔ مگر افسوس خدا نے اولاد نہیں دی ہے۔" ان کا گلا بھر آیا "آپ سے تو ویسے بھی ان کا بوجھ نہ اٹھے گا۔ میں اور میری بیوی مل کر انھیں بالکل اپنے بچوں کی طرح پالیں گے۔ وہ بڑی لجاجت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔" ویسے یقین رکھیئے کہ بچے آپ کے ہی رہیں گے۔ میں آپ کے پاس اپنا پتہ چھوڑ دوں گا۔ آپ کا جب جی چاہے آکر دیکھ لیا کریں۔"

اسلم دل ہی دل میں طنز سے ہنسا
"جب جی چاہے ۔ میرا جی چاہے گا انھیں دیکھنے کے لئے ۔ ؟
ہونہہ ۔ ؟"

"مجھے کچھ اعتراض نہیں ۔" وہ سختی سے بولا۔
"بچے آپ کے ہیں، آپ جو چاہیں سلوک کریں۔" وہ ماما کی طرف مڑا
"بچے ان صاحب کو دے دو۔"

ماما نے سہم کر دونوں بچوں کو دیکھا۔ پھر موسیٰ پر نظر ڈالی۔ بستر کو دیکھا
سامان پر کھا۔ پھر بڑے دکھے لہجے میں بولی۔

"صاحب آپ ہوش میں نہیں ہیں شائد!"
"میں ہوش میں ہوں۔" وہ چیخا "جو کہتا ہوں وہی کرو۔
زیادہ وفاداری نہ جتاؤ۔"

زمیندار جی کی بیوی خوشی خوشی بچے اور سامان سمیٹنے لگی۔ اور ساتھ
ہی ساتھ وہ اسلم کو مطمئن کئے جا رہی تھی۔

"بھائی صاحب! آپ یہ سمجھیں کہ میں آپ کی سگی بہن ہوں اور یہ
بچے جتنے آپ کے ہیں اتنے میرے بھی ہیں۔ پتہ یہ آپ کو دے چکے ہیں
بس یہی خیال رکھئے کہ اب جو آپ نے ہماری دل بستگی کا سامان کیا ہے
تو اُدھر بیچ میں ہمارے کھلونے ہم سے نہ چھین لیجئے۔ جب مامتا پیدا
ہو جائے تو بڑی مشکل سے چھوٹتی ہے۔"

اسلم ٹھس بنا سب کچھ سنتا رہا۔ وہ اس وقت بڑا سکون محسوس
کر رہا تھا۔ اور خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گر ایسے تکلیف دہ

اور نفرت آمیز بوجھ سے چھٹکارا ملا۔ ریل کی کھڑکھڑاہٹ میں دفعتہً اسلم کو محسوس ہوا کہ بچے کے رونے کی آواز بھی اس کھڑکھڑاہٹ میں شامل ہے اس نے پلٹ کر دیکھا دونوں بچے رو رہے تھے۔

"چند روز میں بہل جائیں گے۔" زمیندارن کہہ رہی تھی، ابھی آپ سے مانوس ہیں نا۔ اس لئے اور اس "منے" کا کیا ہے۔ یہ تو سنبھلا سنبھلایا ہی ہے۔ آپ قطعاً فکر نہ کریں۔"

اسلم کو یاد آیا کہ کس طرح منی کے رونے پر خالدہ تڑپ اٹھتی تھی اب اس وقت، وہ کیا محسوس کر رہی ہو گی۔؟ اور اسے لڑکے کا اتنا ارمان تھا اگر وہ یوں روتا دیکھ لے تو اسے کیا سزا دے۔ وہ کھڑکی سے ٹھیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بچے کسی صورت نہ بہل رہے تھے اس نے پلٹ کر یونہی دیکھا۔ ماما آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ کہنے کو ہو رہی تھیں مگر ہمت نہ پا رہی تھی۔ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے بچہ اب زور زور سے رونے لگا تھا۔ اچانک اسلم اٹھ کر گیا۔ اور زمیندارن سے بولا۔

"شائد میرے پاس چپ ہو جائے۔؟"

جیسے ہی اسلم نے اسے بانہوں میں سنبھالا، وہ یوں چپ ہو گیا جیسے ماں کی آغوش میں آ گیا ہو۔ منی بھی دھیرے سے سیٹ پر سے اٹھ کر آئی اور اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اسلم کا دل دفعتہً پھٹ سا گیا۔

"کیا یہ صرف میری محبت کے لئے رو رہے تھے؟؟ آنسو اس کی

آنکھوں سے اُمڈنے لگے۔ انھوں نے میرا بگاڑا ہی کیا ہے۔ یہ تو معصوم فرشتے ہیں۔ یہ تو خالدہ کی محبت کے امین ہیں۔ میں اتنا ظالم کیسے ہو گیا تھا۔" وہ آپ ہی آپ سسک پڑا۔

"دنیا کی سب سے حسین اور خوشبو دار چیز نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے"

اسے کہیں سے خالدہ کے الفاظ کانوں میں بجتے سنائی دیئے۔ اس کے کلیجے سے لگا ہوا یہ ننھا سا خوشبو دار اور خوبصورت وجود کیا واقعی اس لائق تھا کہ اسے خود سے دور کیا جائے۔ اس کی تڑپ دیکھ کر زمیندارن بے صبری سے بولی۔

"یہ آپ سے نہ سنبھل سکیں گے ویسے تو آپ ہی کے ہیں، جب آپ چاہیں ...."

وہ بات کاٹ کر بولا

"مجھ سے سنبھل نہ سکیں گے۔؟ آپ نے کبھی کدو کی بیل دیکھی ہے؟"

کنگن

"ارے سب ٹوٹ گئیں کیا۔؟" فرید شوبی کے قریب آتا ہوا بولا
"ہاں۔ ساری چوڑیاں کرچی کرچی ہو گئیں۔" اور وہ جھک کر اپنی کہنی دیکھنے لگی۔
"ارے رے رے۔ خون نکل رہا ہے کہنی سے۔" اور فرید اس پر جھک گیا۔ "لا پونچھ دوں اپنی دستی سے۔" اور اس نے زبردستی شوبی کا ہاتھ کھینچا۔ دستی میں خون جذب کر کے اس نے شوبی کے چہرے کو دیکھا شوبی اس کے اتنے قریب تھی۔ اس نے شرارت سے اس کا منہ چوم لیا۔
"چلو ہٹو۔ یہ خون پونچھ رہے ہو یا۔۔ اور وہ شرما گئی۔ "بڑے بے شرم ہو جی۔"؟
"اچھا۔" فرید اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہنستے ہوئے بولا۔" اس میں کیا بے شرمی ہو گئی۔ کیا اپنی دلہن کو پیار کرنا بے شرمی ہے ری۔؟"

"ہشت ۔" شوبی شرم سے سرخ پڑ گئی ۔" ابھی اماں دیکھ لیتیں تو؟"
"دیکھ لیتیں تو بس یہی کہتیں کہ میرا بیٹا اپنی دلہن کے سیب لیسے گال چوم رہا ہے ۔"

شوبی کے گال دمک اُٹھے ۔ اس نے سر جھکا لیا اور کرچیں چُننے لگی ۔ فرید سنجیدہ ہو گیا ۔

"شوبی ۔ کانچ کی چوڑیاں بالکل کچی ہوتی ہیں ۔ ذرا سے دھکے سے ٹوٹ جاتی ہیں ۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اپنی پیاری سی گڑیا کے لئے ہار اور کنگن خریدوں مگر ..." وہ چپ رہ گیا ۔

شوبی سر اٹھا کر بولی ۔" اونہہ ۔ فرید ایسی باتیں نہ کیا کرو بھئی ۔ مجھے کسی ہار کی ضرورت نہیں ۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور فرید کے مضبوط ہاتھ اپنی گردن میں ڈالتی ہوئی بولی ۔

"اگر تمہاری باہیں میری گردن میں ہیں تو مجھے کسی ہار کی ضرورت نہیں یہ کیا کسی قیمتی ہار سے کم ہیں ۔"

فرید پھیکی سی ہنسی ہنس پڑا ۔" نہیں شوبی یہ بات نہیں ! مجھے معلوم ہے عورت چاہے جاپان کی ہو یا چین کی ، امریکہ کی ہو یا لندن کی ، برما کی ہو یا ہندستان کی ۔ اسے زیور سے بہت لگاؤ ہوتا ہے ۔ اور تو بھی تو ایک عورت ہے ۔ میں میں جانتا ہوں کنگن اور ہار پہننے کی خواہش تیرے دل میں کب سے پل رہی ہے ۔" اس کی آواز گھٹ سی گئی ۔

شوبی کا سر جھک گیا ۔ اس کے دمکتے چہرے پہ کربناک سی مسکراہٹ چھا گئی ۔

"فرید — وہ تو بچپن کی ایک احمقانہ خواہش تھی۔ تم اس کے لئے اتنا جی نہ کڑھاؤ۔ یقین کرو اب تو میرا دل کبھی نہیں چاہتا کہ ہار کنگن پہنوں۔"

فرید نے اس کی کلائیاں اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ "تیرا دل نہیں چاہتا مگر میرا دل تو چاہتا ہے کہ ان خوبصورت کلائیوں میں جگ مگ جگ مگ کرتے کنگن پہناؤں — اور تیری اور اپنی یہ خواہش میں بہت جلد پوری کر رہا ہوں۔" وہ ہنس پڑا۔

"وہ کیسے — ؟؟" شوبی کے اندر کی زیور کی شوقین عورت چپ نہ رہ سکی۔

"میں جنگ پر جا رہا ہوں — وہاں بہت ....."

مگر شوبی اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چیخ پڑی۔ "جنگ پر جا رہے ہو؟ تم مجھے چھوڑ کر جنگ پر جاؤ گے — ؟"

"نہیں نہیں — ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ محض میرے شوق کی خاطر تم جنگ پر چلے جاؤ۔"

فرید ہنستا ہوا بولا۔ "پگلی لڑکی جنگ پر جانے سے بھلا ہوتا ہی کیا ہے؟ ارے وطن کی خدمت بھی ہو گی۔ اور پھر اپنی تمنائیں بھی تو پوری ہوں گی جو پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔"

شوبی چیخ پڑی۔ "وطن کی خدمت و دمت میں نہیں جانتی — یہ سارے بہانے ہیں — مجھے اپنی غریبی پیاری ہے۔ مگر میں تمہیں ہرگز اپنے سے دور نہ جانے دوں گی۔ اماں کہتی ہیں پچھلی جنگ میں تمہارے بابا

گئے تھے تو پھر کبھی واپس نہیں آئے ۔"

"مگر میں نام بھی لکھوا چکا ہوں شوبی ۔"!

"تم — تم نام لکھوا چکے ہو ۔" ؟ شوبی ہڑبڑا کر بولی

فرید بیاڈلی ہنسی ہنسا ۔" اللہ جانے تم عورتوں نے جنگ کا مطلب موت ہی کیوں سمجھ رکھا ہے ۔ اسے روشن پہلو سے سوچو تو سہی ۔ ہم کامیاب ہو کر لوٹیں گے تو ہمارے پاس خوشیاں ہوں گی ۔ ہماری فتح ہو گی تو ہماری زندگی مسکراہٹوں سے بھر جائے گی — خوشیاں — مسکراہٹیں ۔ دولت ۔ زندہ رہنے کے لئے اور کیا چاہیئے ۔شوبی گڑ گڑیا۔"

"مگر مگر"!... اور شوبی کی آواز آنسوؤں میں دب گئی وہ وہیں بیٹھ گئی ۔ "یہ زندگی نہیں ہے موت ہے فرید ۔"

بوڑھی خاتون لکڑی ٹیکتی ہوئی مرغی خانے کی طرف سے آرہی تھی۔ اس کے لکڑی کے کھڑاؤں کھٹ کھٹ آواز پیدا کر رہے تھے ۔ بہو کو منہ پھیرے بیٹھا دیکھ کر وہ پوپلے منہ سے مسکرائی ۔" بیٹی یہ چاند بھی یوں ہی گزر گیا تم ضرور بچہ پیدا کر رہی ہو" ؟

فرید ہنس پڑا — بوڑھی خاتون اسے ہنستا دیکھ کر ذرا غصّے سے بولی ۔" ہنستا کیا ہے ۔ دیکھتا نہیں بہو کی چال بدل گئی ہے ۔ پچھلا ڈول بھاری ہو گیا ہے — کیا میں نے دھوپ میں بیٹھ بیٹھ کر بال سفید کئے ہیں ۔"

فرید پھر ہنس پڑا ۔ شوبی نے آنسو پونچھ لئے اور جھینپ کر بوڑھی خاتون کو دیکھا، جواب بالکل قریب آگئی تھی ۔

"بیٹی میں نے تم سے کہا تھا۔ صبح ہی صبح سیب کا مربہ کھا لیا کرو مگر تم مانتی ہی نہیں ۔ اب قے کرتی بیٹھی ہو۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں قے کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

شوبی گھبرا کر اور شرما کر بولی ۔ "مگر اماں آپ سے کس نے کہہ دیا۔۔

بوڑھی خاتون بات کاٹ کر چیخ اٹھی ۔" مجھ سے کس نے کہہ دیا۔؟؟ تیرہ بچے پیدا کئے ہیں میں نے اپنے خاوند کے لئے" ۔ اور مجھ سے پوچھتی ہو کس نے کہہ دیا۔۔ دیکھو بیٹی میری بات نہ ٹالو ۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ تمہیں چکر تو نہیں آتے بہت ۔" ؟

شوبی شرما گئی ۔" مگر اماں اس وقت تو میں قے نہیں کر رہی تھی"۔

"ارے تو قے کر بھی کیسے سکتی ہے ؟ پیٹ میں کچھ رہے تو نکلے بھی مجھے معلوم ہے صرف ابکائیاں ہی ابکائیاں آتی ہیں نکلتا نکلاتا کچھ بھی نہیں ۔۔ تین مہینے تک اگر ابکائیاں بہت آئیں تو بیٹی ہے اور۔۔"

فرید کھل کھلا کر ہنس پڑا ۔" ہاں اماں اب تو مجھے ضرور بیٹی چاہیئے ۔ میں اس کے لئے اچھے اچھے کپڑے بھیجوں گا۔ کھلونے بھیجوں گا ، اور ۔۔"

"کپڑے بھیجے گا ، کھلونے بھیجے گا ۔" بوڑھی خاتون حیرت سے بولی ۔" مگر تو جا کہاں رہا ہے جو کپڑے اور کھلونے بھیجے گا رے ۔" ؟

فرید بوکھلا سا گیا ۔ شوبی کی آنکھیں پھر بھر آئیں ۔"اماں ۔ دیکھو نا اماں یہ جنگ پر جا رہے ہیں ۔"

"تو ۔ تو جنگ پہ جائے گا ۔" بوڑھی خاتون نے اپنی لاٹھی ٹیک دی اور دھم سے زمین پر بیٹھ گئی ۔" تو جنگ پر جائے گا اور یہاں

اور یہاں اس بیچاری کو جو تیرے لئے مصیبت اٹھا رہی ہے۔ جو تیرے بچّے کو اپنے پیٹ میں پال رہی ہے۔ اسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ؟؟ میری کوکھ اجاڑ دے گا۔ ؟ مگر تجھے جانے ہی کون دیگا پاگل لڑکے۔ ؟ میں روزانہ کس کا ہاتھ پکڑ کر کھیتوں میں کام کرنے جایا کروں گی؟ ٹونی کس کو پاپا کہہ کر پکارے گا۔ شوبی کہاں سوئے گی۔ ؟ اسے تو تیری باہوں میں سونے کی عادت ہے۔ اسے تو ابھی تیرے لئے۔ اس گھر کے لیے میرے لیے۔ خود اپنے لیے۔ کئی بچے پیدا کرنے ہیں۔ اور جب تو ہی چلا جائے تو پھر......"

"مگر اماں میں نام لکھوا چکا ہوں اور اب تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔" بڑھیا کی قینچی جیسی چلتی زبان رک گئی۔ اس کے ہونٹ کانپ اُٹھے۔ سفید بالوں سے بھرا سر کانپنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

شوبی اس سے لپٹ پڑی۔" اماں یہ کہتے ہیں میرے لیے کپڑے لائیں گے۔ زیور لائیں گے۔ کنگن لائیں گے۔ مگر اماں انھیں کون سمجھائے کہ ان سے دور رہ کر مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیئے۔ نہیں چاہیئے مجھے کھیتوں میں کام کرنا۔ مرغیاں پالنا۔ اپنے ہاتھوں گھاس کے گٹھے کاٹ کر بیچ آنا، بہت پسند ہے۔ مگر یہ پسند نہیں ہے کہ یہ جنگ پر چلے جائیں۔ جنگ سے کوئی واپس نہیں آتا اماں۔" اور اس کی زبان جذبات کی شدت سے رک سی گئی۔

"میں جلد ہی واپس لوٹوں گا شوبی۔ اور تم لوگوں کا یہ خیال بدل

دوں گا کہ جنگ سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا ۔ وطن کے لئے۔۔۔"

شوبی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی ۔ "تم جھوٹ کہتے ہو ۔ تمہیں وطن سے کوئی پیار نہیں ۔ تم محض دولت کے لالچ میں بھرتی ہو رہے ہو ۔ مجھے معلوم ہے ان پگڑی والوں نے پیسے کا لالچ دے کر بہت سوں کو پھانسا ہے۔"

"ہاں ۔" فرید ہونٹ دبا کر سختی سے بولا ۔ مجھے پیسہ چاہیئے مجھے پیسے کا لالچ ہے ۔ کیونکہ مجھے زندہ رہنے کا لالچ ہے ۔ اور مجھے زندہ رہنا ہے ۔ اپنے لیے ۔ تمہارے لئے ۔ اماں کے لئے ، اپنے بچوں کے لئے اور زندگی کے لئے پیسہ بہت ضروری ہے ۔ شوبی ۔ بہت ضروری ۔"

لیکن اب بھی تو ہم زندہ رہ رہے ہیں ۔" شوبی سسکیوں کے درمیان بولی ۔ "پیسہ تو کبھی بھی ہمارے پاس نہ رہا ۔ مگر اب بیٹھے بٹھائے تمہیں پیسہ کمانے کی دھن کیوں لگ گئی ہے ۔ کیا تم اس زندگی سے مطمئن نہیں ۔ جہاں شوبی جیسی بیوی ہے ۔ ٹونی جیسا گڈا بیٹا ہے ۔ اور ایسی محبت کرنے والی اماں ہے ۔ کھیتوں میں کام کرنے سے تم ادب کیوں گئے فرید ۔ میں مر جاؤں گی فرید ۔ جیتے جی مر جاؤں گی فرید۔"

فرید اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ۔ "کھیتوں میں کام کرنے سے میں کیوں اکتاؤں گا میری رانی ۔ جب کہ ہمارا دھندہ ہی سدا سے کاشتکاری رہا ہے ۔ مگر بات دوسری ہے وہ کچھ دیر رک کر بولا ۔ "اب کھیت ہمارے نہیں رہے ۔"

"کھیت ہمارے نہیں رہے ۔؟؟ بوڑھی خاتون جو اب تک پتھر کی طرح ساکت بیٹھی تھی ۔ پوری طاقت سے چلاکر بولی ۔

"ہمارے کھیتوں پر ہمیشہ ہمارا حق رہے گا۔ کھیت میرے ہیں۔ تمہارے ہیں ۔ میرے اور میرے بچوں کے ۔ میرے تیرہ بچوں کے باپ نے ان میں اناج اگایا ہے۔ اپنا پسینہ ٹپکایا ہے۔ اب وہ، کھیت کسی دوسرے کے کیسے ہو سکتے ہیں ۔ میرے ....."

"اماں ۔" فرید سنجیدگی سے بولا ۔" تم نے لگان دیا تھا؟؟"

"لگان ۔" بوڑھی خاتون کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی ۔ اور دھندلی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔

شوبی بپھر کر بولی ۔"تو لگان نہ دینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ کھیتوں پر سے ہمارا حق ہی اُٹھ جائے۔ ؟

فرید مسکرایا۔ "تو بھولی ہے شوبی ۔ زمین دار دو تین سالوں سے ہمارا لگان یونہی تو بھرتا نہیں چلا آرہا ہے۔ ؟ ہم تو بالکل بے بس ہیں۔" تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر بولنے لگا۔" صرف ایک صورت ہے کہ بڑا کھیت قرض کی صورت میں دے دیں اور چھوٹے پر خود کام کریں۔"

"مگر وہ تو بالکل ہی چھوٹا ہے ۔ اس پر تو ہم صرف گوبھیاں ہی اگاتے ہیں ۔ بوڑھی خاتون چلّائی ۔

"جو کچھ بھی ہو ۔" فرید بولا ۔" میں نے آج صبح سب فیصلہ کر دیا ہے بس گوبھی کا کھیت ہمارا ہے اور باقی ۔" وہ مسکرایا ۔ اس کے سوا

چارہ بھی کیا تھا۔ "مگر اماں ۔ آنسو مت بہاؤ۔ میں تمہیں اتنا پیسہ بھیجوں گا۔ کہ ایسے ایسے کئی گو بھیوں کے کھیت تم خرید ڈالو گی ۔ تم خوب امیر ہو جاؤ گی اماں ۔ مگر اماں ۔ میری اماں اتنا وعدہ کرو کہ مجھے بہادری سے جانے کی اجازت دو گی نا ۔" ؟؟ وہ شوبی کی طرف بڑھا ۔" اور شوبی تجھے رانی بنا دوں گا ۔ ہیرے اور لعل جڑے ہوئے کنگن لاؤں گا تیرے لئے ۔ پھر تو کتنی خوش ہو گی ۔ ارے روتی ہے پگلی ۔ ہش ۔" !!

فرید صبح جانے والا تھا۔ اس رات چاندنی چھائی ہوئی تھی ۔ مدھم مدھم ملگجی ملگجی سی ۔ شوبی دن بھر روتی رہی تھی اور فرید اسے باتوں میں بہلا رہا تھا۔ گاؤں سے اور بھی کئی نوجوان جا رہے تھے فرید نے اسے ڈھارس بندھائی ۔

"میں اکیلا ہی تو نہیں جا رہا ہوں شوبی ۔ پھر یہ تیرا رونا دھونا کیسا ہے ؟ مگر شوبی کے آنسو نہ تھمتے ۔ ابھی ان کی شادی کے دو ہی برس گزرے تھے ۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ فرید سے اس کی شادی ہوئی تھی ۔ دن ، دن بھر وہ انجیر کی ڈالیوں پر بیٹھ کر گیت گاتے ۔ چاندنی راتوں میں کھیتوں پر نکل جاتے ۔ اور بوڑھی خاتون انھیں دیکھ کر کتنی خوش ہوتی ۔ ؟ تیرہ بچوں میں سے دو لڑکیاں اور ایک بیٹا ہی زندہ رہے تھے۔ لڑکیاں اپنے گھروں کی تھیں اور اب فرید ۔ اس کا اونچے قد ۔ مضبوط ہاتھ پیروں والا بیٹا، جو بالکل اپنے باپ

پڑ گیا تھا۔ وہی تو تھا جس کی وجہ سے گھر بھر میں رونق تھی اور پھر شادی کے نو ماہ بعد بیٹا ہوا تھا۔ بوڑھی خاتون کا پیارا پوتا ۔۔ کتنے دنوں اس نے شوبی کو باہر نہ نکلنے دیا۔۔ ؟ اس کا رنگ اور نکھر آیا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں اب اور بھی چمک دار ہو گئی تھیں۔ گالوں پر شادابی امڈ آئی تھی ۔۔ سنہرے بال سونا بن گئے تھے ۔۔ اور یہ سب کچھ کتنی جلد بیت گیا۔ کتنی جلد ختم ہو گیا۔ کھیتوں پر ساتھ ساتھ کام کرتے وہ کبھی نہ تھکتے۔ بوڑھی خاتون کی آنکھیں بچا کر فرید اسے گود میں اٹھا لیتا اور اس کے گال چوم لیتا ۔ وہ شرم سے لال ہو جاتی ۔ اور اس کے مضبوط ہاتھوں میں خود کو بے بس سی محسوس کرنے لگتی۔

یہ بے بسی بھی اسے کتنی پیاری لگتی!

مگر اب یہ مضبوط بازو اس سے دور جا رہے تھے۔ کون جانے فرید کب واپس آئے ۔۔ اور کب اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اٹھا لے ۔۔ اور کون جانے واپس ہی نہ آئے۔!!

شوبی اپنے بستر پر پڑی کسمسا رہی تھی، فرید ٹونی سے فضول باتیں کر رہا تھا۔ مرغی خانے کی طرف سے اپنی لاٹھی ٹیکتی ۔ کھڑ ادیں کھڑ کھڑاتی بوڑھی خاتون آئی اور بولی۔

"فرید ۔۔ آج تو تمہیں شبانہ بیٹی کے ساتھ جلد ہی سو جانا چاہیئے تھا۔ صبح تمہاری روانگی ہے۔ اور تم یوں دور دور ہو رہے ہو ۔۔ وہ روتی پڑی ہے۔ لاؤ ٹونی کو میں سلاؤں۔ آج تو..... اور وہ ٹونی کو پیٹھ پر لاد کر کھڑ ادیں کھڑ کھڑاتی چلی گئی۔

فرید دھیرے سے شوبی کے بستر میں گھس گیا۔ شوبی اس سے لپٹ کر سسک پڑی۔ فرید نے اسے سینے سے لپٹا لیا اور خود بھی سسک اٹھا۔ مدھم سی لو میں فرید نے دیکھا۔ اس کی آنکھیں خون برسا رہی تھیں آنگن میں گلاب کھل رہا تھا۔ اور آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ شوبی تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

"فرید۔" وہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز سے بولی

"کبھی چراغ سے اس کی لو الگ ہوئی ہے" ؟؟

"نہیں۔" فرید کانپ کر بولا

"کبھی پھول سے اس کی خوشبو جدا ہوئی ہے۔" ؟؟

"میں نے کب کہا ہے۔"

"کبھی آسمان سے چاند نوچا جا سکا ہے ؟"

فرید پگھل پگھل گیا۔ شوبی اس سے لپٹ کر چیخ اٹھی

"نہیں نہیں، نہیں۔ تو پھر تم مجھ سے کیوں کر جدا ہو رہے ہو۔ میں تمہاری لو ہو۔ تمہاری خوشبو ہوں۔ تم آسمان ہو میں چاند ہوں۔ پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے فرید۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تم سے الگ ہو کر میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ چراغ بجھ جائے گا۔ پھول مرجھا جائیں گے۔ چاند بے نور ہو جائے گا۔ میرے فرید۔"

چاند ادھر سے ادھر ہو گیا۔ رات آدھی بیت گئی۔ مگر شوبی کی آنکھوں کے ستارے ابھی بھی جگمگا رہے تھے۔

"فرید جا تو رہے ہو مگر میری ایک بات مان لو۔"

"کون سی بات ؟" فرید بے تابی سے بولا

"مجھے کبھی خط مت لکھنا۔"

"شوبی ۔ یہ کیا کہہ رہی ہے تو ۔ تجھے خط نہ لکھوں تو جیوں کیسے ؟ تو اتنی ظالم پہلے تو کبھی نہ تھی ۔"

"میں یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکوں گی فرید ۔ تمہارا خط آیا کرے گا اور میرے دن رات مجھ پر حرام ہو جائیں گے ۔۔ زخم ہرے ہو جایا کریں گے تم کیوں نہیں سوچتے فرید تمہارے بنا میرا جیون کچھ نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔"

شوبی رات بھر روتی تڑپتی رہی ۔ فرید کے مضبوط اور گرم سینے سے لگ کر بھی وہ خود کو بے کل محسوس کر رہی تھی ۔ شوبی کی گرم اور تیز تیز سانسیں فرید نے اپنی گردن پر محسوس کیں ۔

"شوبی میں مر جاؤں گا ۔" وہ گھٹ کر بولا

"فرید ۔ شوبی نے دل کاٹ دینے والے لہجے میں پوچھا ۔" جب میری چوڑیاں ٹوٹ جایا کریں گی تو کون خون پونچھنے کے بہانے ، جھک کر چوما کرے گا ۔ ؟؟"

کئی زمانے بعد فرید کا خط آیا ۔

" شوبی میری جان ۔ یہ طویل مدت بہت جان لیوا تھی ۔ میں کیسے تیری بات مانوں ۔ ؟؟ اتنی ظالم نہ بن ۔ میں اچھا ہوں ۔ بہت اچھا ۔ میری فکر نہ کیا کر ۔ بس تیری یاد کا غم ہے ۔ اور کوئی دکھ نہیں ! ہاں ابھی تو پیسوں کی گنجائش نہیں ہے مگر میں بہت جلد اس

قابل ہو جاؤں گا کہ بہت سارا روپیہ ۔ بہت سارا پیار تجھے دے سکوں پھر تو ہم کئی کھیت خرید لیں گے ۔ مجھے اپنے کھیتوں کی زندگی بڑی پسند ہے شوبی ۔ میں جلد ہی آؤں گا ۔

اماں کیسی ہیں ۔ لوٹنی مجھے یاد تو ضرور کرتا ہو گا ۔ اور آنے والی گڑیا کو میرا بہت بہوت پیار ۔

میں تیرے لئے ترستا ہوں

سدا تیرا ہی فریدا

" میں تیرے لیے ترستا ہوں ۔ " شوبی نے خط کئی بار پڑھا ۔ اتنا کہ اسے رٹ گیا ۔ کتنا مختصر، کتنا مفصل ۔ لگتا تھا پیار اور محبت کی پوری دنیا اس میں سمو کر بھیج دی ہے ۔"

فرید نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی ۔ کتنی تڑپ تھی شوبی کے خط میں ۔

میرے فرید ۔ میرے سہارے !

سوچ رہی ہوں تمہیں کیا لکھوں ۔ مجھے تمہاری کتنی یاد آتی ہے اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا ۔ خدا بھی نہیں ۔ مجھے راتوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا تمہاری سانسیں میرے گالوں کو چھو رہی ہیں ۔ کئی بار ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے ہاتھ میری گردن میں پڑے ہوئے ہیں ۔ مگر میں کتنی اداس ہو جاتی ہوں کہ یہ تم نہیں میرا وہم ہے ۔ زندگی

کتنی بے رحم ہے فرید ۔ اسے ہمارے معصوم پیار پر بھی رحم نہیں آتا ۔؟

ایک خبر سنو ۔ اس ہفتے یا اگلے ہفتے ۔ ہم شہر جارہے ہیں ۔ وجہ بس اتنی ہے کہ تمہارے پیچھے لوگوں کی آنکھیں ہوس سے بھر گئی ہیں مگر فرید میں تمہارے ہی لئے تھی ۔ اور تمہارے ہی لئے رہوں گی ۔ تم نے اتنا بڑا دکھ سہہ لیا کہ مجھ سے جدا ہو گئے تو کیا میں تمہارے پیار کے بچاؤ کی خاطر کارخانے میں کام نہیں کرسکتی ۔؟؟ کھیت ہم نے کلّو دادا کے سہارے چھوڑ دیا ہے ۔ جو کچھ بھی وہ دے دیں ۔ میں اگلے خط میں پتہ بھجوادوں گی ۔ تم فکر نہ کرنا فرید ۔

ٹونی کچھ باتیں کرتا ہے ۔ تمہارے جانے کے بعد کئی دنوں تک تمہیں پوچھتا رہا ہے ۔ اور میں یہ سب کچھ کیسے برداشت کرپائی ۔ مجھے حیرت ہے ۔ اگر وہ اچھی طرح بات کرنے لگے ۔ تو میں اسے وہ گیت سکھاؤں گی ۔ جو ہم انجیر کی ڈالیوں پر بیٹھ کر گایا کرتے تھے ۔

ایک اچھی سی بات سنو ۔ مگر یہ تو کان میں دھیرے سے کہی جانے والی بات ہے ۔ کل اماں ایک دائی کو بلالائی تھیں ۔ مجھے دیکھ کر بولی ۔" بہو کو زیادہ نیند آتی ہے تو ضرور ہی بیٹی ہو گی ۔" اس وقت تم مجھے کتنے یاد آئے فرید ۔ ! اور یوں کب تمہاری یاد نہیں آتی ۔؟؟ ۔ مجھے کبھی بھی بخار آجاتا ہے تو اماں کہتی ہیں ۔" دق نہ ہو جائے ۔" مگر میں تمہارے لئے زندہ رہوں گی فرید ۔ مجھے تو تمہیں وہ مالا پہنانی ہے جو میں نے اپنے آنسوؤں سے تمہارے لئے گوندھی ہے ۔ آ ڈگے نا چاند ! اماں اچھی ہیں نہ ہنستی ہیں نہ روتی ہی ہیں ۔ تم سے کٹ گئے

دعدے کو پوری طرح نبھا رہی ہیں۔ ننھی منی آنے والی گڑیا پوچھتی ہے۔

"مجھے اپنے بابا کی صورت کب دیکھنے کو ملے گی۔؟"

میں زندہ ہوں صرف تمہارے سہارے

تمہاری ہمیشہ تمہاری شوبی

تھوڑے دنوں بعد فرید کو شوبی کا ایک اور خط ملا۔ کسی اور کے ہاتھ کا لکھوایا گیا۔ فرید لفافہ دیکھ کر چونک گیا۔ میری اتنی پڑھی لکھی بیوی اور خط پر پتہ کسی اور کے ہاتھ کا۔؟

فرید میرے سہاگ!

اب جدائی برداشت نہیں ہوتی میری جان۔ جلد آؤ۔!!

دل چاہتا ہے تمہیں خود ہی خط لکھوں۔ روز لکھوں مگر تین دن سے بری طرح بخار ہے۔ یہاں ایک پیاری سی بچی ہے وہی میرا خط لکھ رہی ہے ہاں۔ میں زندہ ہوں۔

سدا تمہاری شوبی

"ہاں۔ میں زندہ ہوں۔" فرید کا دل کٹ کے رہ گیا۔

تین ہفتوں بعد فرید نے شوبی کو بڑا مختصر سا خط لکھا۔

شوبی گڑیا۔

تجھ سے چھپاؤں۔؟ کیا چھپاؤں۔ نہیں میرے بیچ کوئی راز نہیں۔ میری طبیعت خراب تھی۔ اس لئے خط نہ لکھ سکا۔ پریشان مت ہو جانا۔ شوبی تیرے ہاتھ۔ کومل ہاتھ کیا اس قابل تھے کہ مشین چلاتے۔؟؟ آہ! میں کتنا بے بس ہوں۔

تو سچ کہتی ہے زندگی بڑی ظالم ہے۔

یادیں اور پیار ۔ تیرے لیے ۔ اپنی زندگی کے لئے ۔

تیرا صرف تیرا

فرید کی ٹانگ میں گولی لگ گئی تھی ۔ ڈاکٹروں نے مشورہ کیا اور گھٹنے کے پاس سے ٹانگ کاٹ دی ۔ ٹانگ سڑ چکی تھی اس کے علاوہ چارہ بھی نہ تھا ۔ ان دنوں اسے شولی کا صرف ایک خط ملا تھا ۔ جس میں اس نے صرف ایک ہی شعر لکھ کر بھیجا تھا ۔

رات کچھ ایسا تصوّر نے ترے بیخود کیا
ڈال کر اپنے گلے میں اپنی بانہیں چوم لیں !

اور فرید نے محض اتنے سے کاغذ کے پرزے کو پڑھ کے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں ۔ کاغذ کے اس پرزے کو اتنا چوما اتنا پیار کیا کہ اسے آنسوؤں سے مٹا دیا ۔

فرید کے چار خطوں کے جواب میں شولی کا ایک خط آیا وہ بھی اسے بالکل مختصر لگا ۔

فرید میرے دیوتا ۔ ! !

کتنے دنوں بعد تمہیں یاد کر رہی ہوں ۔ ؟ ؟ تمہارے بھیجے ہوئے پیسے مل گئے ضرور تم نے اپنے کسی دوست سے اُدھار لیے ہوں گے ۔ کلّو دادا کہا کرتے تھے جنگ پر جانے والوں کو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی ۔ کیا سچ تم نے ایسا ہی کیا ہے ۔ ؟ ؟

یہ میری اپنی تحریر نہیں ہے ۔ کیسی زندگی ہے فرید ۔ مگر پھر بھی تمہارے انتظار میں اچھی ہی کٹتی ہے ۔ شائد ہم پھر گاؤں واپس چلے جائیں

۔ کیوں ؟ آنے والا وقت ہی اس کا بہتر جواب دے سکے گا ۔؟؟

شاید تمہاری ننھی منی گڑیا اسی ہفتے جنم لے لے ۔ پچھلی رات تو مجھے سخت درد اٹھا تھا ۔ کتنی پیاری پیاری باتیں ہیں یہ سب ۔ مگر تم کتنے دور ہو ۔

ڈبی لوٹی پھوٹی بات کرنے لگا ہے ۔ مگر بہت اچھی طرح نہیں میں نے اسے انجیر کی ڈالیوں والا بہار کا گیت نہیں سکھایا ہے ۔ درخت کلیوں اور شگوفوں سے لد گئے ہیں ۔ مگر میرے محبوب ! تم مجھ سے دور ہو" (بس آجاؤ میرے محبوب) اماں مجھ سے چڑ رہی تھیں کہ بچوں کو ایسے گیت نہیں سکھانے چاہئیں ۔ بہر حال تم نے اپنی صحت کے بارے میں خاموشی کیوں اختیار کر لی ۔ ؟؟

تمہارے مقدر کی ساری کٹھنائیاں میرا مقدر بن جائیں ۔

سدا تمہاری شوبی

خط میں شوبی نے اپنا دل نکال کر بھیج دیا تھا ۔

فرید نے شوبی اور اماں سے جھوٹ نہیں کہا تھا ۔ واقعی وہ جنگ سے زندہ واپس ہو رہا تھا ۔ ٹانگ کٹ جانے کا تاوان بھی اسے ملا ۔

" اب ہم اپنے کھیت واپس لے لیں گے ۔ اس نے خوشی سے سوچا اس نے بڑی جلدی میں شوبی کو خط لکھا ۔

گڑیا میری

میں آرہا ہوں ۔ اس خبر نے تیرے دل پر کیا اثر کیا ۔ واپس آرہا ہوں اور اس شان سے کہ جیبیں بھری ہوئی ہیں ۔ اب ہم پھر

اپنے کھیتوں پر کام کر سکیں گے۔ اور ان کھیتوں کا کیا غم۔ وہ پچھم طرف جو نالہ ہے نا اس کے سامنے والی زمین کے دو بڑے ٹکڑے خریدیں گے اب اور کیا چاہیئے ہمیں۔ اماں سے یہ خوشخبری سنا دے کہ میں آرہا ہوں۔ اور ہاں ان کے لیئے نئی وضع کے جوتے لا رہا ہوں۔ ان کے لکڑی کے کھڑاویں تو بری طرح کھڑکھڑاتے ہیں۔ ٹونی اور ننھی گڑیا (تو نے کیا نام رکھا ہے۔) کو اس کے باپ کا پیار پہنچا دے۔

اچھا ایک بات تو سن۔ (او، گالوں پر ابھی سے گلابیاں بکھر گئیں) ہاں میری جان میں نے تیری حسین کلائیوں کے لیئے زوردار کنگن بھی خرید لیئے ہیں۔ مگر ایک بات کا خیال آتا ہے کہ اب نہ تو تیری کانچ کی چوڑیاں ٹوٹیں گی اور نہ میں جھک کر خون ہی پونچھ سکوں گا۔ اوہ! ابھی تک نئی دلہنوں جیسا شرماتی ہے۔!

بہت سارے پیار
تیرا پیار

اسٹیشن پر فرید مع اپنے دوسرے ساتھیوں کے اترا تو پیر دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ تمام اسٹیشن بھرا پڑا تھا۔ عجیب سی چیخ پکار تھی۔ لوگ رو رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔ نام لے لے کر زور زور سے پکار کر رہے تھے۔ مگر اتنے سارے ہجوم میں فرید کو کہیں بھی شوبی نظر نہ آئی۔ اسے ایک دم خیال آیا۔" اماں تو مہینوں زچہ خانے سے نکلنے نہیں دیتیں۔ وہ ضرور ہی زچہ خانہ میں پڑے پڑے میرا انتظار

کر رہی ہو گی ۔"

بلیسا کھیاں کھٹ کھٹا تا جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو لوٹی سامنے ہی کھیل رہا تھا ۔ فرید کو آتا دیکھ کر وہ بوڑھی خاتون سے لپٹ گیا ۔ بوڑھی خاتون نے پلٹ کر دیکھا ۔ فرید لنگڑاتا چلا آرہا تھا وہ سن ہو گئی ۔

اماں ۔ اماں میں آگیا نا ۔ تم تو کہتی تھیں ۔ جنگ پر جانے والے بچ کر نہیں آتے ۔"

"ہاں بیٹا ۔ تو آگیا ۔" بوڑھی خاتون خوابیدہ لہجے میں بول رہی تھی ۔ "ہاں تو جنگ سے آگیا ۔"

"اماں شوبی کہاں ہے ۔" وہ دھیرے بولا ۔

بوڑھی خاتون نے اسے حیرت سے دیکھا اور یوں پیچھے آنے کا اشارہ کیا جیسے وہ گونگی ہو ۔

فرید خوشی سے کمرے میں داخل ہوا ۔ پلنگ پر تکیے کے سہارے شوبی بیٹھی ہوئی تھی ۔ سلیٹی رنگ کی شال لپیٹے وہی شوبی بالکل وہی ۔ فرید کو دیکھتے ہی وہ اک دم چونکی ۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ۔ "فرید ۔ تم ۔ یہ بیسا کھیاں ۔"

فرید ہنس پڑا ۔ "ارے میں زندہ آگیا کیا یہ خوشی کی بات نہیں کئی بیچارے تو اپنی جان سے گئے ۔"!

"اوہ شوبی یہ رونے کا نہیں ہنسنے کا موقع ہے ۔" پھر اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا بولا ۔

"ارے باتیں تو پھر ہوں گی ۔ میں اپنی رانی کے لیے کنگن لایا

ہوں کنگن ۔" اور اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ جگ مگ جگ مگ ۔ اور ہنس پڑا۔

بوڑھی خاتون گھبرا کر باہر نکل گئی اور شوبی کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی ۔ وہ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی ۔

"ایسی کیا جلدی ہے پھر پہنا دینا ۔"

ارے واہ یہ کیسے ممکن ہے ۔ لا تو تیرے ہاتھ ۔ اوہو! تُو تو بس یوں اوڑھی لپٹی بیٹھی ہے ۔"

شوبی کربناک انداز سے مسکرائی ۔ تھی کمبل ہٹا دو نا ۔ مارے خوشی کے میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے ہیں تمہیں دیکھ کر ۔" اور اس کے پتلے پتلے بے رنگ سے ہونٹ بھنچ کر رہ گئے ۔

فرید نے لپک کر کمبل ہٹایا ۔ اور اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی ۔ "شوبی ۔"

"فرید ۔" شوبی سرد آواز سے بولی ۔ "کارخانے کی نوکری کا تحفہ ۔!! میرے ہاتھ مشین سے کچل گئے تھے ۔ تمہیں بھلا کیسے لکھتی؟"

کنگن فرید کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے ۔ شوبی کے دونوں ہاتھ کہنیوں کے پاس سے کٹے ہوئے تھے ۔

دو بیٹیاں

میں اکثر سوچتی ہوں کہ خدا اگر عورت کا نام عورت نہ رکھ کر محبّت رکھ دیتا تو کیا ہوتا۔ یقیناً کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس لیئے کہ عورت محبّت ہی کا تو دوسرا روپ ہے۔ نام بدل جانے سے کیا ہوتا ہے؟ حقیقت تو نہیں بدل جاتی نا؟ کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں دل کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ سارے کھیل اور سلسلے محبّت اور دل کی نرمی ہی کے تو ہیں۔ بات کتنی چھوٹی سی تھی۔

پچھلی گرمیوں کی بات ہے۔

دھوپ میں بلا کی تیزی تھی۔ گرمی یوں پڑ رہی تھی جیسے اب کے برس پڑ کر پھر کبھی نہ پڑوں گی۔ انسان ہی کیا جانور اور چرند پرند تک حواس کھو بیٹھے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بجلی کی چھت والا پنکھا پوری رفتار سے چلائے اپنے ننھے بچے کے ننھے منے کپڑے سیتی بیٹھی تھی۔ میرے

کمرے کی کھڑکی جو ہوا کے رخ پر کھلتی ہے، ہوا کو اندر لانے میں کافی ناکام ثابت ہو چکی تھی۔ گرمی ہی اس غضب کی تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے وہ کھڑکی یوں ہی کھلی رکھی تھی کہ دھوپ کی ماری چڑیاں۔ کبوتر اور بھولی بھٹکی رنگین چڑیاں اس کھڑکی سے داخل ہو کر میری الماری پر بیٹھ جاتیں اور میرے کمرے میں ایک سہانا شور بس جاتا۔ مجھے پھر ایسا لگتا کہ بچوں کی پکار ہی نہیں پرندوں کی چہچہاہٹ بھی گھر کو سہانا بنانے میں اہم رول ادا کرتی ہے

اسی دن کی بات ہے۔ میں سر جھکائے مشین چلانے میں مصروف تھی کہ میرے سر کے عین اوپر ننھے منے پر پھٹ پھٹائے۔ پھر اکدم ایک چڑیا صوفے کے پیچھے جا گری، ہائے یہ بد نصیب۔ میں نے لرز کر کہا۔ دھوپ سے پناہ لینے کمرے میں گھس تو آئی لیکن سیدھے پنکھے سے جا ٹکرائی۔ اب کیا بچے گی وہ۔ دراصل یہی وہ لمحہ تھا جب عورت پن کی ساری کمزوریوں برائیوں اور طاقتوں کے ساتھ محبت مجھ پر غالب آئی اور میں سب کچھ، چھوڑ چھاڑ تیزی سے صوفے کے اندر جا گھسی۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے یوں کہ کوئی رہ رہ کے کلیجے کو نوچتا ہو۔ کہیں وہ مر نہ گئی ہو۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں اُسے تھام لیا۔ میرا دل رک رک کر چلنے لگا۔ ننھی سی جان کی بساط ہی کیا تھی۔ اور بجلی کا قاتل پنکھا جبکہ اپنی پوری رفتار سے چل رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ پر پھیل چکے تھے اور آنکھیں جن میں تھوڑی سی جان پڑنے سے زندگی کی بھیک مانگتی جان پڑتی تھیں مجھے رہ رہ کر ابھار رہی تھیں۔

"مجھے بچا لو۔ مجھے زندگی کی طرف لوٹا لو۔" میں نے بیحد کانپ کر

سوچا۔ نعوذ باللہ ۔ میں کون ہوتی ہوں بچانے اور زندگی بخشنے والی۔ پالن ہار تو وہ رب العزت ہے۔ جو چاہے تو ساری دنیا ایک لمحے میں فنا ہوجائے۔ اور جو چاہے۔ تو اُجاڑ اور سنسان دنیا کو اسی لمحے گلستان بنا دے۔ میں نے اپنے خدا سے اس ننھی سی جان کی سلامتی کی بجید بھرپور دعا مانگی۔ جو بذات خود ننھی سی تھی۔ لیکن جو کسی کی تنہائیوں کی ساتھی بھی ہو گی۔ جو کئی ننھے منے چوں چوں کرتے بچوں کی ماں بھی ہو گی اور ان کی محافظ بھی۔ اس کے ننھے منے گدبدے بدن کی گرمی سے ابھی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ پنکھے نے پوری طرح اپنا وار نہیں چلایا ہے۔ اور وہ زندہ ہے۔ میں نے بجید ممتا کے ساتھ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اسے چھپایا اور نسبتاً ایک ٹھنڈے اور پرسکون کونے میں لے جا کر لٹا دیا، یہ سوچ کر کہ اسے بھوک نہ لگی ہو، میں نے چاولوں کے تھوڑے سے دانے اور ایک ننھی سی پیالی میں پانی بھی اُسکے آگے لے جا کر رکھ دیا۔ اور خود وہاں سے ہٹ آئی۔ سیون میں پھر میرا دل نہ لگا۔ جانے وہ بچے کہ نہیں۔ دل میں بار بار کوئی سرگوشی سی کئے جاتا تھا۔ پھر میرا انتھا بھی اٹھ گیا۔ میں کونے میں خبر لینے پہنچی تو وہ بھی ٹنگیا ہوا آگیا۔ جو چیز میرے سکون اور اطمینان کا سوال بنی ہوئی تھی وہی میرے ننھے کا کھلونا بن گئی۔ خدا کی قدرت کیسی عجیب ہے۔ ننھا کچھ ڈر کر، کچھ دلچسپی سے، کچھ حیرت سے، اسے جھک جھک کر دیکھتا رہا۔ پھر اُسے بھوک نے آلیا۔ اور وہ دودھ کی خاطر رونے لگا۔ میری ممتا دہرے انداز سے جاگی۔ وہ بھی تو بھوکی ہے۔ میں نے درد کے ساتھ سوچا اور پانی کی کٹوری کے چند قطرے انگلیوں سے اٹھا کر اس کی چونچ پر ڈالے۔ میری خوشی

کی انتہا نہ رہی کہ اس نے اپنی چونچ کھولی اور پانی کی خوشگوار ٹھنڈک کو حلق میں محسوس کرتے ہی مندی مندی آنکھوں کو اک ذرا سا کھول کر میری اور دیکھا۔ مارے خوشی کے میرے ہاتھ پاؤں کپکپا گئے۔ ارے یہ تو زندہ ہے۔ ۔ ارے یہ تو زندہ ہے ۔"

اب کے میں نے چاول کے دانے اس کی چونچ سے قریب کر دیئے، شائد بھوک محسوس کرنے پر کھالے۔ اتنے سارے دانوں میں مجھے لیکن پتہ کیوں کر چلے گا کہ وہ کچھ نہ کچھ کھا چکی ہے۔ میں نے سارے دانے ہٹا کر سو دانے گنے اور اس کے آگے کر دیئے کہ دو تین گھنٹوں بعد آکر گنوں گی۔

تنہائی مریض کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ بہتر ہو جو تم یہاں سے ہٹ جاؤ۔" میرے دل نے مجھے مشورہ دیا۔ اور میں بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے پیچھے دیکھتی آگے بڑھتی وہاں سے نکل آئی۔ بالکل اسی انداز میں جیسے مریض خود پر سکون ہو۔ لیکن تیمار دار ہر لمحہ کانٹوں کا گچھا نگل جانے کی سی کیفیت محسوس کرے۔

شام کو جب وہ آفس سے آئے تو روز کی طرح ٹیبل پر چائے سجائے ان کی منتظر رہنے کی بجائے میں کونے میں چڑیا پر جھکی تالیاں بجا رہی تھی اور ننھا بچہ ننھے ننھے قہقہہ لگا رہا تھا۔ بات یوں ہوئی تھی کہ دو گھنٹوں بعد جب میں آئی اور چاول کے دانے گنے تو وہ کل بینتیس ہی نکلے۔ میری خوشی کا عالم نہ رہا۔ وہ سیدھے اندر والے کمرے ہی میں آئے اور ہم دونوں ماں بیٹے کو یوں مسرور اور شادماں دیکھ کر حیرت سے بولے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھئی — ؟"

میں نے جلدی سے انھیں بھی گھسیٹا اور چڑیا کے قریب لے آئی مارے خوشی کے میرے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وہ اسی لہجے میں بولے۔

"ہاں ہاں چڑیا تو میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر — !"

تب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اور کچھ اس انداز میں، جیسے کوئی بچہ نئی نئی گفتگو کرنی سیکھے، اور کوئی طویل سی بات ٹھیک طرح ادا نہ کر پائے۔ میں نے صبح سے لے کر اب تک کی ساری واردات انھیں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہہ سنائی کہ کس طرح چڑیا پنکھے سے ٹکرائی کیسے میں نے اسے اٹھایا۔ کس طرح خدا سے دعا مانگی۔ کیونکر اس کی پیاس بجھائی، کیسے اس نے چاول کھائے اور — اور میں خوشی سے بے قابو ہو کر بولی۔

"سچ کہیئے اب یہ زندہ بچ جائے گی نا —" !

اُف وہ مردوں کی ازلی بے حسی — کوٹ اُتارتے ہوئے وہ کافی سرد لہجے میں بولے — "تم یہ بھول گئیں کہ خود بھی ایک بچے کی ماں ہو ہاں اگر ننھا اس قسم کی "اکسائیٹ منٹ" کا مظاہرہ کرے تو ٹھیک ہے لیکن ..... میرا دل بجھ سا گیا — حد ہے مردہ دلی اور بے حسی کی۔ میں تو اس بارے میں سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ ننھی منی چڑیا جب صحت مند ہو گی، اڑنے کے قابل ہو گی۔ اپنے ساتھی کے پاس پہنچے گی۔ اپنے ننھے منّوں کو اپنی چونچ سے کھلائے گی۔ بلا سے تو وہ کس قدر خوش اور مسرور نہ ہوں گے! لیکن یہ !!

واقعی خدا نے عورتوں اور مردوں کے انداز فکر میں کس قدر تضاد رکھا ہے میں پھر ایک لفظ نہ بولی ۔ انھیں چائے دیکر اور ان کا ضروری کام نپٹا کر میں چڑیا کی خدمت میں مشغول تھی ۔ میرا دل اندر سے چاہ رہا تھا کہ اسے ہاتھ میں لے کر دیر تک رکھوں ۔ پروں کو الٹا کر دیکھوں کہ کہیں زخم وغیرہ تو نہیں ہے ۔ خون تو نہیں نکل رہا ہے ۔؟ لیکن میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ چڑیوں کی قوم بہت تنگ نظر ہوتی ہے ۔ اگر کوئی انسان کسی چڑیا کو ہاتھ میں لے لے تو پھر دوسری چڑیاں اسے ذات باہر کر دیتی ہیں ۔ پتہ نہیں اس بات میں کہاں تک صداقت تھی اور پھر یہ بھی تو تھا کہ میں اسے ایک بار ہاتھوں میں اٹھا کر اس کونے سے اس کونے تک لا ہی چکی تھی اب دوسری بار بھی چھو لوں تو کیا حرج ہے ۔؟ میں نے ڈری ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اتفاقاً کوئی چڑیا، چڑا موجود نہ تھا ۔ میں نے بے حد پیار سے اسے ہاتھوں میں سمیٹ لیا ۔ اور پروں کو بے حد آہستگی سے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی، ہائے ۔ ہائے ۔ میرا دل تڑپ اٹھا ۔ بے چاری کے نچلے پر سے ذرا سا خون رس رہا تھا، تبھی تو وہ اڑنے سے قاصر تھی ۔ میں نے اسے اتنی ہی احتیاط سے نیچے رکھ دیا اور پھر کچن کی طرف دوڑی ۔ ہلدی پکا کر جلدی سے اس کی مرہم پٹی کی ۔ اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرنے لگی ۔ اس بیچ میں شوہر نامدار نے دو چکر لگائے ۔ ہر بار میری پیٹھ تھی لیکن میں بغیر مڑے ہی ان کے چہرے کو پڑھتی گئی ۔ تیسری بار وہ آئے تو میرے شانے نے ان کے لطیف اور محبت بھرے ہاتھ کا دباؤ

محسوس کیا - مجھے بری طرح رونا آگیا۔ "خدا کی قسم بالکل بچی ہو۔ اب یہ رونا دھونا کس بات پر ۔ "؟ حالانکہ وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور میں جانتی ہوں کہ ہلکی سی خفگی اور جھڑک کے بعد محبت بھرا ایک لمحہ ضبط کے بندھن توڑ دینے کو بعید کافی ہوتا ہے ۔ اور پھر میری حالت تو صبح ہی سے چڑیا کے مارے غیر ہوئی جارہی ۔ آنسوؤں نے ہزار بار اُمڈنے کی کوشش کی لیکن کوئی کارگر بہا نہ ہاتھ نہ آیا تھا ۔ لیکن اب انکی محبت !! انھوں نے میری دلجوئی کی خاطر وہیں بیٹھک بنا لی ۔ جم کر بیٹھتے ہوئے بولے "تو آپ یہ چڑیاں پال لیں گی ۔" میں سمجھ گئی! اس وقت تو وہ سراسر شرارت اور چھیڑ کے موڈ میں تھے ۔ کیونکہ اب انکے چہرے پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی ۔ لیکن میں پوری سنجیدگی سے بولی ۔

"خواہ مخواہ پالوں گی ۔ اور جو اس کے بچے اور شوہر ہوگا تو ۔"؟

"اجی بس رہنے دیجئے ۔ آجکل کی خواتین تک کو شوہروں کا خیال نہیں تو پھر یہ تو چڑیاں ہی ٹھہریں ۔"

اکدم مجھے خیال آیا کہ رات پڑنے کو آئی اور ابتک میں نے ان کے کھانے پینے کا بندوبست نہیں کیا ہے ۔ میں اٹھنے لگی تو انھوں نے مجھے پکڑ کر بٹھا دیا اور پیار سے بولے "میں تو مذاق کرتا تھا ۔ تم سنجیدہ ہوگئیں ۔ لیکن ایک بات کہوں تمہارا یہ انہماک ۔ یہ محنت ، یہ تڑپ ، یہ بیتابی ، دیکھ کر سچ مچ ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ چڑا چڑیا نہ ہو تمہاری بیٹی ہو ۔۔ اور تم اس کی ماں ہو؟"

وہ کس قدر بڑی بات کہہ گئے تھے ۔ میرا سینہ جذبات کی شدت

سے بھر آیا۔ لاکھ ضبط کرنے پر بھی پھر سے میرے آنسو جھر جھر بہنے لگے رات بیحد بے کلی میں کٹی ۔ کئی بار اٹھ کر جانا چاہا۔ لیکن ننھے کو مجھ سے لپٹ کر سونے کی عادت تھی۔ اگر اسے ہٹاتی تو وہ چیختا اور یوں ان کی بھی نیند خراب ہوتی ۔ دن بھر کا تھکا ماندہ مرد گھر پہ آئے اور رات کو سکون سے سوئے تو یقیناً بیوی کا فرض ہے کہ اس کے آرام میں مخل نہ ہونے پائے ۔ میں نے بیحد فرماں برداری کے سے انداز سے یہ سب سوچا اور سونے کی کوشش کرنے لگی، اس ڈر سے کہ اسے بلی وغیرہ اٹھا نہ لے جائے ۔ میں نے اسے ایک ٹوکرے میں بند کر دیا تھا۔ اور ٹوکرے پر بھاری سا پتھر رکھ دیا تھا۔ صبح کے ستارے نے آخری سسکی لی۔ اور ادھر میرا دل سینے میں تڑپا۔ لیکن .... کہیں .. کچھ اور سوچنے سے پیشتر میں نے چھلانگ لگائی اور بے تابی سے ٹوکرا الٹ دیا۔ چڑیا ایک طرف کو جھکی مزے مزے سے دانے چگ رہی تھی ۔ میرے ہاتھ آپ ہی آپ خدا کے آگے اٹھ گئے اور سر جھک گیا۔ دوسرے دن اتوار تھا مجھے عام بیویوں کی طرح اتوار کا بیحد انتظار رہتا ہے کہ ہفتہ بھر کی جدائی کے بعد دن بھر کے لئے شوہر کا ساتھ ملتا ہے۔ اتوار کا دن ہم کبھی باہر نہیں گزارتے دن بھر ساتھ رہتے ہیں۔ باتیں ہنسی مذاق ۔ کس کا دل چاہے گا کہ گھر میں ہنسی خوشیوں کی جنت چھوڑ کر باہر جہنم کی آگ میں تپیں ۔ لیکن اس دن ان کا گھر رہنا مجھے کھل رہا تھا۔ اتوار بیچ میں آپڑنے سے الجھن ہو رہی تھی ۔ صرف اس لیئے کہ وہ میری ہر ہر حرکت پر نظر رکھیں گے ۔ اور ہنسی اڑائیں گے لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب نیند سے جاگتے ہی انھوں نے بغیر

کسی طنز یا مذاق کے سیدھے سادے لہجے میں، جس میں فکر کی ہلکی سی جھلک بھی تھی پوچھا چڑیا کا کیا حال ہے۔ ؟"

محبت کی بھوکی عورت، پیار کے صرف اسی ایک لمحے کے لئے شاید میکے کو اتنی آسانی سے، اتنی جلدی بھلا دیتی ہے۔ میں نے بیحد خوش ہو کر کہا "خدا کا فضل ہے۔ اب تو وہ چل پھر بھی رہی ہے۔"

"اچھا۔" انھوں نے بغیر کسی بناوٹ کے کہا۔"

"چلو ذرا میں بھی دیکھوں۔" چڑیا نے اپنے قریب دیکھ کر کسی قسم کی اجنبیت کا یا ڈر کا اظہار تک نہ کیا، کیا مزے سے بیٹھی ٹک ٹک دیکھتی رہی۔ انھوں نے ایک پتھر پھینکا، جو سیدھا دل میں جا گڑا۔

"اب شام تک یہ اڑ جائے گی۔"

"جی۔" میں بیحد دہل کر بولی "اڑ جائے گی۔" وہ پیار سے ہنسے اور کہا۔ "تندرستی مل جانے کے بعد بھی وہ کیا یوں ہی بیٹھی رہے گی اس کا بھی تو گھر ہوگا۔ بچے ہوں گے۔"

"اور شوہر۔ ؟" میرے تڑپتے دل کو تھوڑا سا قرار ملا ہاں اگر وہ اڑ کر اپنے بچوں اور شوہر کے پاس جائے تو مجھے ملول ہونے کی کیا بات ہے۔ ؟"

اتوار کا سارا دن چڑیا کی دیکھ بھال میں گذرا۔ ہم دونوں اسی کمرے میں اسی کونے میں بیٹھے رہے۔ ننھا بھی ہمارا ساتھ دیتا رہا اس دن ہم نے چائے کھانا سب زمین پر ہی کھایا۔ زمین پر ہی آرام کی خاطر لیٹے۔ یہ دیکھ دیکھ کر بیحد خوشی ہوتی رہی کہ چڑیا اب بڑی

آسانی سے پھدک رہی تھی - اور اب ہمارے اندازے کے مطابق صبح تک ضرور اس لائق ہو جائے گی کہ ایک ہی جست لے کر اڑے اور اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں سے جا ملے۔ شام کو مجھ کو ایک انوکھا سا خیال آیا۔ میں میز پر سے ان کی لال روشنائی کی داوات اٹھا لائی اور بولی۔

ہم چڑیا کو سرخ رنگ سے رنگ دیں گے۔!!

"رنگ دیں گے - ؟ کیوں - ؟"

ان کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی -

"ارے اس میں حیرت کی کون سی بات ہے -؟ میں چاہتی ہوں، جب بہت ساری چڑیوں کے غول میں ہماری یہ زخمی چڑیا ہمارے آنگن اور منڈیروں پر آیا کرے تو ہم بھی تو پہچان سکیں اور خوش ہو سکیں کہ یہ وہی ہے -"

"لیکن - " وہ چپ رہ گئے -

"لیکن - لیکن ؟" میں بے تابی سے بولی -

"کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے قدرے مختلف پا کر دوسری چڑیاں ٹھونگ مار مار کر برادری سے باہر کر دیں - ؟"

بس - اتنی سی بات - ؟ میں سکون کا سانس لے کر بولی - ایسا نہیں ہو گا اس کا مجھے یقین ہے - کیونکہ بچپن میں ہم سب سہیلیاں چڑیاں رنگ رنگ کر چھوڑ دیتی تھیں اور وہ مزے سے اپنی ڈاریں جا ملتی تھیں - میں نے اور انھوں نے بڑی آہستگی سے پیاری پیاری چڑیا کو بالکل ایک دلہن کی طرح سرخ رنگ سے لاد دیا۔

رات کو حسب معمول میں نے چڑیا کے آگے کٹوری میں پانی اور دانے رکھ دیئے اور میں اطمینان سے سو گئی۔

دوسری صبح میں نے انھیں بھی ساتھ لیا اور چڑیا کے ٹوکرے کے پاس پہنچی میں نے بیحد خوشی سے ٹوکرا اٹھایا۔ سرخ رنگ کی چڑیا بیحد بشاشت سے چوں چوں کر رہی تھی اور ٹوکرے کے حدود میں گھوم پھر رہی تھی۔

اوہ — وہ حیرت سے بولے۔ "تم نے تو اسے سچ مچ ایک دلہن کی طرح سنوار دیا ہے۔"

دراصل میں نے ان کے آفس گئے بعد ایک بچپنے کی حرکت یہ کی تھی کہ ایک سنہرے موتیوں کی چھوٹی سی مالا بھی چڑیا کی گردن میں ڈال دی تھی اور واقعی اس کا روپ دلہنوں کی طرح نکھر آیا تھا۔ میں بے حد محبت اور اطمینان کی ہنسی ہنسنے لگی۔ وہ بیحد دم لینے والی اداسی سے بولے۔

"عورت ہر روپ میں عظیم ہے۔ چاہے وہ بیٹی ہو — بیوی ہو ماں ہو — تم نے تو اسے بالکل ایک ماں کی طرح بیٹی بنا کر رکھا اور ایسے ہی وداع بھی کرو گی۔ جیسے کوئی ماں بیٹی کو ڈولا چڑھاتی ہے۔"

میرا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ چڑیا دھیرے دھیرے یہاں وہاں پھدکتی رہی۔ پھر شائد اس نے اپنی اڑان کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے ایک بھرپور جست لگائی۔ اور میری اور ان کی آنکھوں سے دور آسمان کی وسعتوں میں غائب ہو گئی۔

"ارے — وہ جیسے خواب سے چونکے" چلی گئی کمبخت۔"

واقعہ یہ ہے کہ پہلے ہی سے مجھے بے حد رونا آرہا تھا۔ اور چڑیا کے اڑتے ہی اور ان کے تبصرے کے ساتھ ہی میرے آنسو بہنے لگے انھوں نے مڑ کر مجھے دیکھا، کچھ سراسیمہ اور پریشان سے ہو کر بولے "کیوں فضول آنکھیں گنواتی ہو، چڑیاں بھی کہیں کسی کی میت ہوئی ہیں۔ بے وفا کہیں کی۔"!

لیکن ان کے جملوں سے مجھے کوئی تسلی نہ ہو سکی۔ میں کتنی ہی دیر تک اسی اور دیکھتی رہی جدھر سے چڑیا اڑ گئی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال آرہا تھا کہ میں نے دو دن سہی، لیکن اس کی کتنی چاہت، کتنی دیکھ ریکھ، کتنی محبت اور فکر کی، اور اس بے وفا نے اڑنے سے پہلے مجھے دیکھا تک نہیں۔ اب بھلا کہاں لوٹ کر آنے چلی۔!!

بہت سارے دن گزر گئے۔ لیکن میں بھی کس درجہ حساس (یا صحیح معنوں میں بے وقوف) تھی کہ ہر دن یہ آس لے کر جاگتی اور ہر رات یہ امید لے کر سوتی کہ کبھی تو وہ پلٹے گی اور میری ہتھیلی پر آکر بیٹھ جائے گی۔ لیکن وہ نہ لوٹی۔

لیکن ایک دن میں مارے خوشی، حیرت اور جذبات کے گنگ سی ہو گئی کہ وہی سرخ چڑیا ایک اور چڑے کے ساتھ (جو یقیناً اس کا شوہر ہی تھا) میری کھڑکی کے پٹ پر بیٹھی چک چک چوں چوں کئے جا رہی ہے۔

میں بے حد بے تاب مامتا کے ساتھ لپکی، کچھ اس آس سے جیسے مجھے دیکھتے ہی وہ میری گود میں آپڑے گی۔ لیکن میرے غم کی انتہا نہ رہی کہ اس نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ ایک بار ہلکی سی چک چک کے ساتھ میری

طرف چونچ اٹھا کر دیکھا تو سہی، لیکن اتنی اجنبی نگاہیں جیسے کبھی شناسائی تک نہ تھی ! اور میں اس غم سے سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ میرے دل کا خیال کئے بنا چڑا چڑی دونوں چک چک چوں چوں کرتے، دور خوشی خوشی اڑ گئے۔
انسان عقل مند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن شدید احساس کے ہاتھوں جانور سے بھی زیادہ بے وقوف بن جاتا ہے۔ کم از کم چڑیا کے غم میں نڈھال ہو کر میں تو یہی سوچنے پر مجبور تھی۔ شدید احساس بھی تھا اور ندامت بھی۔ کسی سے نہیں ان سے — صرف ان سے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ چڑیا کس طرح مجھ تک آکر بھی مجھ تک نہ آئی۔ یوں دیکھا جائے تو قصور کسی کا بھی نہیں تھا۔ لیکن میرا دل —؟ اُف !!

بہت سارے دن گزر گئے، چڑیا کا خیال اور اس کی بے وفائی کا گلہ دل سے ہٹتا ہی نہ تھا۔ ایک دن میں یوں ہی دہلیز پر نڈھال سی بیٹھی تھی کہ خاکی کپڑوں والا پوسٹ مین ایک زرد زرد سا اداس لفافہ میری گود میں پھینک گیا۔ خط —؟ کس کا خط —؟ میں نے حیرت سے سوچا۔ اس لئے کہ ادھر جب سے میری شادی ہوئی تھی اور میں نئی دنیا اور نئی خوشیوں کی جنت میں کھو گئی تھی — میری ہر کسی سے خط و کتابت بند ہو چکی تھی — نہ میرے پاس کسی کا خط آتا تھا اور نہ میں ہی کسی کو لکھتی تھی ایسے میں کسی کا خط آجاتا میرے لئے آٹھواں عجوبہ تھا۔ میں نے حیرت سے لفافہ کھولا۔ میری کنوارپن کی سہیلی زرینہ کا شکایتی خط تھا —"

پیاری بلّو، خط پاکر حیرت نہ کرو، بلکہ ہو سکے تو تھوڑا سا رو لینا۔ یہ صحیح ہے کہ تمہیں نئی زندگی، نئی دنیا، شوہر، بچہ، سب کچھ مل گیا۔ لیکن

یوں کوئی اپنے پیچھے چھوٹ آنے والی دنیا کو بھلایا کرتا ہے۔ مے دے کے میکے میں تمہارے ابو ہی تو ہیں۔ مجھے تو وہ دن بھولتا ہی نہیں جب انھوں نے سرخ لباس اور زیوروں سے لاد کر تمہیں ڈولے چڑھایا تھا اور تمہارے آنسو بہے ہی جاتے تھے۔ کچھ یوں کہ جیسے تم انھیں کبھی نہ بھلا سکو گی نہ ان کے بغیر جی سکو گی۔ اور اب ذرا سوچو کٹھنائیاں اٹھا کر پالنے پوسنے، اور مر مر کر تکلیف اور انتظار اٹھانے والے ماں باپ کیا ایک خط سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں؟

بچا جان سارا دن تمہارے خط کے منتظر رہتے ہیں انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے۔ میں خود سے یہ خط تمہیں لکھ رہی ہوں تم کچھ سوچ سکو۔

زرینہ کا خط میں نے اتنی بار پڑھا اور اتنا روئی کہ الفاظ بہہ گئے ایک خیال دل کو کچوکے دیئے جا رہا تھا۔ اس چڑیا کو میں نے صرف دو ہی دن ذرا تکلیف اٹھا کر پالا تو اس کی بے اعتنائی نے مجھے یوں دکھ دیا اور میں جو اپنے پیچھے اکیس ۲۱ برس کا بندھن توڑ کر آئی تو میری کٹھورتا سے ابو کے دل پر کیا گزرتی ہوگی،

وہ دن اور آج کا دن — پھر کبھی میں نے چڑیا کی بے وفائی کا گلہ نہیں کیا۔

چڑھاوا

خالہ بی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ منہ کا رنگ فق ہو گیا تھا اور ہاتھ پیر مسلسل کانپے جا رہے تھے۔ پاس کھڑی ہوئی کریمن کو انھوں نے سر سے پاؤں تک دیکھا اور آہستہ سے مگر تیز لہجے میں پوچھا۔

"تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔؟"

کریمن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "اے بی، میں جھوٹ کہوں تو میرے منہ میں کیڑے پڑیں۔ میں نے خود کمرہ جھاڑتے ہوئے پھولوں کے گچھے پھینکے ہیں۔ اے بی، میں تو روز ہی جھاڑتی ہوں۔ آگے بھی دنا یک بار پھولوں کی مرجھائی کھلائی پتیاں دکھائی دیں۔ میں

سمجھی یہی کوئی بچہ وچہ ڈال گیا ہوگا۔ مگر کل تو خود میں نے اپنی آنکھوں سے زہرہ بی بی کے سرہانے پھول دیکھے ہیں۔ اور ہاں۔" اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔" بالوں میں تازہ گجرا بھی — اب کیا بولوں، مجھے بھی تو ایک دن مرنا ہے۔"

کریمن کی بات پر یقین نہ کرنا گناہ سے کم نہ تھا۔ خالہ بی کے اپنے بچپن سے وہ ملازم تھی۔ اور اب خالہ بی کے بچوں کے بچوں کو وہ کھلا رہی تھی اور یوں بھی اسے جھوٹ بولنے کی پڑی ہی کیا تھی۔ خالہ بی کا دل پھر چھالیہ کاٹنے میں لگ نہ سکا۔ ان کا دل کہہ اٹھا۔" ضرور زہرہ نے پھول توڑے ہوں گے۔ زندگی چلی گئی مگر زندگی کا مزہ نہ گیا۔"

منصور میاں مرے اس وقت زہرہ کی عمر یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ ابھی دو مہینے ہوئے منصور میاں کی تیسری برسی ہوئی تھی اور زہرہ نے رو رو کر اپنا منہ سجا لیا تھا۔ بیس اکیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟ گڑیا جیسی تو لگتی۔ کسی بات کا ڈھنگ نہ تھا۔ ادھر پیام آیا کہ ماں باپ نے اٹھا بھی دیا۔ تین برس راج کیا۔ چوتھے سال بیوہ ہوگئی اب نصیبوں میں یہی پتھر لکھے تھے۔ بھلا تین برس میں کیا سلیقہ قرینہ آجاتا؟ اور میاں کے مرے بعد تو اور بھی زندگی سے اوب گئی! زندگی میں مزہ ہی کیا باقی رہ گیا تھا۔؟ دو برس تو جوں توں سسرال میں کاٹے، ساس نندوں نے ہاتھ دھو پیچھا اٹھا لیا۔ وہ منہ پھوڑ طعنے دیئے کہ گداز گدار جسم سہتے سہتے لکڑی کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔

اب چار چھ مہینے سے ماں کے گھر تھی۔ اپنے کمرے میں گم سم پڑی

پڑی رہتی - نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا ٹھکانا، اور یوں شادی ہو کر بھی بے چاری کو کیا سکھ ملا - منصور میاں کی ایک شادی آگے بھی ہو چکی تھی - بڑے گھرانے کی بیٹی اُٹھائی تھی - دان دہیز اتنا ملا کہ تمام عمر بیٹھ کر کھاتے تب بھی ختم نہ ہوتا - وہ تو مثل ہی ہے کہ چنے ہیں وہاں دانت نہیں اور جہاں دانت ہیں وہاں چنے نہیں - برس گزرا، دو برس گزرے - تین، پانچ اور پھر دس برس گزر گئے، مگر دلہن کی گود ہری نہ ہوئی - لاکھوں ہی علاج معالجے کئے تعویذ گنڈے کرائے - مگر مراد بر آتی دکھتی نہ آئی - ساس نندیں پہلے تو چپ چپ رہیں - پھر دبے الفاظ میں کہنا شروع کیا - اور پھر کھلے بندوں کہنے لگیں -

"اے میاں کیا بانجھ کو مٹی پکڑ لائے - اولاد ہی نہ ہوئی تو یہ موئی دولت کس کام کی - ؟"

"بس ہوا میاں - بہت دنوں راہ تک لی - اب کر ڈالو دوسری شادی -"

منصور میاں پہلے تو ہاں ناں کر کے ٹالتے رہے - آخر کو مرد کی ذات تھے - بہلاوے پھسلاوے میں آ ہی گئے اور ماں بہنوں نے جو مرضی دیکھی تو زہرہ کے باپ کو جھٹ پیام دے ڈالا - اب لاکھ سوکن بھی تھی مگر پیسہ بھی تو بھرپور تھا - اور پیسہ تو تمام عیوب پر شامیانہ بن جاتا ہے - دو ایک بیبیوں نے منہ ہلایا بھی -

"اے بی سوکن پر دے کر زندہ در گور کرنا ہے کیا بیٹی کو - عمر تو دیکھو منصور میاں کی - چالیس سے بھی ڈھل رہی ہے -"

مگر دینے والوں نے ہی دھیان نہ دیا تو کون دیتا۔ پھر بڑے تاشے باجے بجے اور دھوم دھام سے زہرہ بیگم منصور میاں کے گھر راج رچنے چلی گئیں زہرہ کی اپنی کیا رائے تھی یہ پوچھنے کی کسی کو ضرورت پیش آئی نہ اس کا سوال ہی اٹھا ۔ بھلا پوچھنا بھی کیا۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز موجود ۔ آسائش کے لئے ہر نعمت میسر۔ پھر لڑکیوں سے پوچھتا بھی کون ہے ۔ ماں باپ جو بھی کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں ۔ پال پوس کر جو بڑا کرتے ہیں تو محبت ہوتی ہی ہو گی ۔ یہ نہیں کہ بوجھ اُٹھایا اور سر سے پھینک دیا ۔

مگر بھئی غیب کا حال خدا کو معلوم یا جس پر بیتے اس کے دل کو معلوم ۔ چار چھ مہینے بعد زہرہ سسرال سے لوٹی تو ایسا گویا مہینوں کی بیماری کاٹ کر اٹھی ہو ۔ رنگ پیلا پیلا جیسے بھرپور بہار میں ترائی کے پھول ، قد تو پہلے ہی سرو کی ڈالی کی طرح لچکتا لچکاتا تھا ۔ اب تو بانس کی بانس معلوم ہوتی تھی ۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں مستی جھوما کرتی، اب اپنے حلقے چھوڑ کر نکلی پڑتیں ۔ اور چلتی تو یوں ڈگ ڈگ ہو کر، گویا ابھی چلتے میں چکر کر گر پڑے گی ۔

کسی نے کچھ پوچھنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ بڑی بوڑھیوں نے سمجھ لیا دن چڑھ گئے ہوں گے ۔ تبھی تو یوں کمھلا کر رہ گئی ہے ۔ مگر اس نے نہ تو کبھی ابکائی ہی لی نہ جی متلانے کی ہی شکایت کی ۔ سکھی سہیلیوں نے چھیڑا بھی تو یوں گم سم ٹھونٹھ بنی بیٹھی رہی ۔ گویا جان ہی نہ ہو بدن میں ۔ کپڑے تو وہ جھب کا بھولی پہنتی کہ شعاعیں سی پھوٹتیں ۔ زیور اتنا کہ بدن جھکا پڑتا مگر سارا رس جیسے کسی نے چوس لیا تھا ۔ لے دے کے اس کی ساری

دل چسپی اپنے موتیا کے پودوں سے تھی جو اس نے اپنے کنوارے پن میں بڑے چاؤ چونچلوں سے لگائے تھے۔ سب سوتے ہی رہتے اور خود وہ صبح سویرے اُٹھ کر ان کی دیکھ بھال کرتی۔ پودے ذرا بڑے ہوئے تو ان میں کلیاں آئیں۔ کلیاں پھول بنیں مگر یہ پھول اس کے سہرے میں گوندھنے ہی نصیب نہ ہوئے۔

منصور میاں کی دوسری شادی تھی بس نکاح مقصود تھا۔ سہرے۔ پھولوں کی نوبت کاہے کو آتی۔ دھوم دھڑاکا تو خوب ہوا مگر پھول نہ چڑھے۔ یہ رواج ہی تھا منصور میاں کے ہاں والوں کا کہ دوسرے چڑھاوے میں پھول نہ چڑھتے۔

ایک بہار گزری اور دوسری بہار آنے سے پہلے ہی پھر اسے سسرال جانا پڑا۔ موتیا کے پودے پھر مرجھانے لگے، دو برس پیچھے لوٹی تو یوں کہ جیسے پہچاننا مشکل تھا۔ شادی سے پہلے ہی ایسی کون کھِر کم تھی۔ ہاں بھرا بھرا گداز بدن ضرور تھا۔ کہاں وہ بھری بہار میں مہکتے پھول جیسا چہرہ اور کہاں تو مرجھائی بیل جیسی ہو رہی تھی۔ جھکی پڑ رہی تھی۔ ماں کی خوشی تھی کہ گود بھرے گی۔ ساس کو کیسے کیسے ارمان تھے کہ پوتا کھلاؤں گی، بڑھتی فصل کو ایسا پالا مار گیا کہ یہ ہوا نہ وہ ہوا۔ ادھر دیکھتے ہی دیکھتے منصور میاں کو دل کا درد اٹھا اور ایسے ختم ہو گئے گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ زہرہ تو ساکت ہو کر رہ گئی۔ سکوت ٹوٹا تو اتنا روئی کہ بے ہوش ہو ہو گئی اپنے شوہر سے کسے محبت نہیں ہوتی۔ اور پھر ایک ہندستانی عورت کو۔ مگر منصور میاں کا لا ولد

مرجانا معمولی بات نہ تھی۔ کہنے والوں نے جو منہ کے ذرا پھٹ پھٹے تھے۔ کہا بھی مگر ڈر ڈرتے ڈرتے۔ مگر اب کہنے سُننے سے ہونا بھی کیا تھا۔ پیسے کی لالچ میں دو زندگیاں تباہ کیں۔ ماں بہنوں کو ہی اتنا خیال ہوتا مگر تبھی کی آنکھیں اندھی تھیں تو راستہ بھی کون دکھاتا۔

زہرہ ابھی کچی کلی تھی۔ موتیا کی کومل کلی۔ جو کسی کی سیج پر نہ کھلی ہوا کے تیز جھونکے سے آپ ہی آپ ٹوٹ کر گر پڑی۔

پروائی ہوا کے جھونکے چلتے۔ ساون کی رم جھم گھٹائیں چھاتیں پاپی من ویاکل ہو ہو اُٹھتا۔ پھر بہار آ گئی۔ کلیاں تھیں کہ بھونروں کا منہ چوم چوم کر بے باکی سے جھومنے کھلنے لگیں۔ اور ادھر رات ہوتے ہوتے سارے آنگن میں بہار ہی بہار بچھ جاتی۔ خوشبوؤں سے مہکار سے آنگن بھر جاتا۔ بڑے چاؤ سے، بڑی لگن سے زہرہ پودوں کے پاس جاتی۔ مگر پھر لوٹ لوٹ آتی، بیوہ تھی۔ ہار سنگھار، چوٹی کنگھی، بھلا کرتی بھی کیسے؟ آسمان نہ ٹوٹ پڑتا۔ زمین نہ نگل جاتی۔

اللہ جانے کیا خبط تھا زہرہ کو۔ راتوں کے اندھیاروں میں اٹھتی۔ موتیا کے پودوں کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور کچی کلیوں کو توڑ توڑ کر مسل دیتی، پھر آپ ہی آپ اس کی آنکھیں بھیگ اٹھتیں اور نین کے برسات شروع ہو جاتی۔ آنسوؤں نے رہا سہا رس کس بھی چوس لیا۔ پھر بھی کوئی سہارا تھا تو وہی پھول وہی کلیاں۔

جانے ایک دن کیا دل میں آئی کہ دامن بھر پھول سمیٹے اور کمرے میں لا کر بچھا دیئے۔ صبح کو جھاڑو دینے کریمن آئی تو زہرہ کو دیدے

پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی، منہ سے تو کچھ بولی دولی نہیں۔ دوسرے دن پھر وہی رنگ دیکھا — پھر تو معمول ہی ہوگیا۔ مگر ایک دن تو غضب ہی ہوگیا۔ پھولوں کا گجرا زہرہ کے سیاہ ریشمی بالوں میں پڑا جھول رہا تھا۔ اور کچی پکی کلیاں پنکھے کے پاس — شریف گھرانوں کی پردہ دار بیبیاں ایسے اوچھپن کاہے کو کرتی ہونگی — اور پھر بی بی بھی کیسی کہ جوان اور اوپر سے بیوہ —۔ برسوں سے نمک کھایا تھا۔ پیٹ میں اتنی بڑی بات کاہے کو رکھتی اس نے بھلائی اسی میں سمجھی کہ خالہ بی سے کہہ دے — خالہ بی کا تو سنتے ہی رنگ فق ہوگیا۔ منہ پر ہوائیاں اڑ اڑ گئیں — یقین نہ آتا تھا کہ زہرہ ایسا بھی قدم اٹھا سکتی ہے — کہ کنواری بھی نہیں — بیوہ ہو کر بالوں میں گجرا گوندھ لے۔ پھولوں کا لہکا مہکا گجرا ابھی تازہ ہی تازہ تھا کلیاں اپنے بدن کی مست خوشبو زہرہ کے بالوں میں چھپانے بھی نہ پائی تھیں کہ خالہ بی دندناتی ہوئی پہنچیں اور اس کے بالوں سے پھول کھسوٹ ڈالے۔

"بیوہ ہو کر سنگار کرتی ہے زہرہ! مر کیوں نہیں جاتی، ہماری ناک کٹانے سے پہلے، سننے والے سنیں گے تو کیا منہ پر تھوکیں گے، کہ رانڈ مونڈ ہو کر بیسواؤں کی سی چھب دکھاتی ہے۔ یا مولا تو ہی خیر کرے تو کرے —"

شام کو چپ چپاتے میں خالہ بی نے سب سے کہہ دیا کہ زہرہ کھلے دیدوں ناک کٹانے پر تل گئی ہے۔

خالو میاں نے سلجھی ہوئی رائے دی۔

"صمدو میاں پڑھے لکھے ہیں - پرانی باتوں کو نہیں مانتے - اپنے بیٹے کے لئے زہرہ کو مانگ رہے سمجھتے -"

خالہ بی نے دیدے پٹ پٹا کر ان کی طرف دیکھا - "میں کہوں تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے کیا بیوہ کا نکاح کروگے . ؟ اور جو پورے زمانے میں تھڑی تھڑی ہوگی - تو - منہ اونچا کر سکوگے . بس آگا دیکھا نہ پیچھا جو منہ میں آیا اُگلتے چلے گئے -"

خالو میاں نے ٹھنڈے دلوں کہا - "سوچو - غور کرو اور پھر بات پکی کرو - بیوہ کی شادی ایسی کوئی بری بات نہیں - یہ ضرور بری بات ہے کہ بیوہ اور وہ بھی جوان بیوہ - سنگھار پٹار کرے - اور پھر گھر میں جوان لڑکوں کا آنا جانا بھی ہے . ہاں -" اور خالو میاں معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو رہے .

خالو میاں نے تو ایسے نچے دل سے بھرپور بات کہی، گویا کوئی بُرائی ہی نہ تھی اس میں - اور یوں سوچو تو کتنی بری بات تھی یہ - بھلا شریف گھرانے کی بیٹیوں نے کبھی دو دو شوہر برتے ہوں گے . اب مردوں کی بات جانے دو - چار چار شادیاں وہ کریں . اس پر بھی چکلوں میں جائیں، تاک جھانک کریں . سب روا ہے . مرد ذات کو کیا کسی کے کہنے سننے کا ڈر - مگر، ایسا کہیں ہوا ہے کہ کھلی آنکھوں جیتی جاگتی مکھی نگل لیں -

ماموؤں، پھوپھیوں، خالاؤں کی میٹنگ ہوئی اور طے ہوا کہ شادی کر دینا ہی اچھا ہے - آگے چل کر کوئی بری بات ہوئی تو

کہیں برادری میں منہ دکھلانے کے لائق نہ رہیں گے۔ شیطان بہکانے آتا ہے تو پوچھ کر نہیں آتا۔ بات صاف سیدھی تھی خالہ بی کی سمجھ میں آ گئی۔ اور صمدو میاں کے گھر ہاں میں جواب بھجوا دیا گیا۔

رزاق میاں بی، اے کر چکے تھے۔ اعلیٰ ملازمت پر فائز تھے اعلیٰ تعلیم کی خوبو رکھتے تھے۔ خیالات بھی بڑے اونچے اور پاکیزہ تھے

"پرانی باتوں کا توڑ توڑنے کے لئے صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا۔ عملی طور پر آپ خود آگے نہیں بڑھیں گے تو جاہلوں سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔"

رزاق میاں کا یہی کہنا تھا۔ اور اپنے کہے کو وہ یوں نبھا رہے تھے کہ بیوہ سے شادی کر رہے تھے۔ وہ تو اپنے خیال میں بڑا ایثار کر رہے تھے۔ مگر سچ پوچھو تو بے چاری زہرہ سہاگن ہی کب ہوئی تھی۔ کہ بیوہ بھی ہو جاتی۔ ادھ کھلی کچی کلی تھی کہ بیاہ دی گئی۔ پھول بننا نصیب ہی کہاں ہوا۔؟ دنیا والے تو سمجھتے رہے کہ بہار سر پر کھیل رہی ہے۔ مگر خزاں کا ایسا بھرپور تسلط تھا کہ بھولے بسرے بھی کلیاں نہ مہکیں۔

زہرہ نے جب سنا کہ اس کی دوبارہ شادی ہو رہی ہے تو سناٹے میں آ گئی۔ پھر وہی ڈھولک ڈھمکا ہو گی۔ پھر زیور چڑھیں گے۔ پھر سجاؤ بناؤ ہوں گے۔ اور سب کچھ تو ملے گا ہی مگر زندگی کہاں ملے گی۔؟

موتیا کے پھول ہوا کے ہلکے ہلکوروں سے کانپ رہے تھے۔ زہرہ

پتھر بنی بیٹھی تھی - دو چار پھول ہوا کے زور گملے میں گر پڑے اور نیچے پڑی پتیوں سے لپٹ لپٹ گئے

"مجھے کبھی تو پھولوں کا لمس محسوس نہ ہوا -" زہرہ نے کراہ کر پھولوں کو سنایا اور مجھے تم سے محبت کتنی رہی - ؟"

سر سر سر - ہوا چلی - پھول مہکے، ہلکی ہلکی سی لپٹ آئی اور زہرہ خوشبوؤں میں نہا گئی -

زہرہ کے جہیز کا سارا سامان تو منصور میاں کی ماں بہنوں نے رکھ لیا تھا۔ ماں باپ کے غصّے سے بلانے پر زہرہ یوں ہی چلی آئی تھی - مانگنے کے لئے زبان تک نہ ہلائی - اور یوں بھی مانگنے کی ضرورت بھی کیا تھی یہاں تو گھر بھرا پڑا تھا۔ کس چیز کی کمی تھی - پیسہ تو یہاں یوں ٹپکتا جیسے درختوں سے ذرا سے ہلانے پر بیر زمین پر آپڑتے ہیں۔

لاکھ بیوہ کی شادی تھی، تھی تو شادی ہی، پھر سے جھوڑ جھمکے ہونے لگے ہر چیز تیار ہونے لگی ـ سب گویا یہ بھول ہی بیٹھے تھے کہ کہ یہ دوسری شادی ہے۔ سب کام یوں گرم جوشی سے ہو رہے تھے گویا پہلی برات ہے۔ خالو میاں کو صمد و میاں کی ایسی پشت پناہی ملی کہ ان کی آنکھوں کے پردے تو ہٹے ہی ہٹے - خالہ جی بھی ساری بدنامی و دنامی بھول بھال گئیں - اور کیا کوئی برائی کرنے تو نہیں جا رہے تھے - پھر ڈر کیا - دنیا والوں کا کیا ہے جو چاہے کہتے پھریں -

خالو میاں بار بار جتاتے :-

"دیکھو بھئی جہیز ایسا دو کہ کسی چیز کی کمی نہ رہ جائے - آگے ہی تو

بے چاروں نے بیوہ بیٹی اٹھائی ہے۔ کسی بات پر شکایت کا کا موقع نہ ملے انھیں۔"

ہر ہر چیز کی گنتی لگتی، کوئی کمی نہ رہ جائے۔ زہرہ ان باتوں سے یوں بے تعلق رہتی گویا یہ سب دھوم دھڑکے کسی اور کے لئے ہو رہے ہوں۔ مسکراہٹ تو سدا ہی سے روٹھ چکی تھی۔ اب تو آنسو بھی ساتھ چھوڑ گئے کدھر سے نصیبوں پر سیاہی بکھر گئی تھی اللہ ہی جانے۔ کہیں پر سے بھی پتہ نہ چلتا کہ یہ بھی کوئی متنفس ہے۔

شادی کے دن تو دھوم دھڑکے میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ گھر کے ہر ہر کونے سے چیخ و پکار۔ اور شور شرابے کی مدھم اور تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ بڑے کمرے میں جہیز کے بے حساب چمکیلے جوڑے سجائے گئے تھے۔ بھڑک دار کرنیں، چمکاتے جوڑے کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ زیورات ایسے گویا زیوروں کی دکان کھل گئی ہو۔ شعاعیں سی پڑ رہی تھیں۔ جگ مگ۔ جگ جگ مگ۔ چم چم۔ چم چم۔ اجالا ہی اجالا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں سیر نہ ہوتیں۔ دولھا والوں کی طرف سے چڑھاوا آیا تو وہ بھی بھرپور۔ گھر میں ہزاروں سورج گھس پڑے تھے جیسے۔

چڑھاوے کی کشتیاں کھلیں تو، سہرا ندارد۔ زنانے میں سے کسی نے چلا کر پوچھا

"ارے جی چڑھاوے میں پھولوں کا سہرا تو ہے ہی نہیں۔"

کسی نے ادھر سے جواب دیا۔ "وہ چونکہ بیوہ کی شادی تھی اس لئے

سہرا نہیں چڑھے گا۔" زہرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

بڑی ممانی جھلا کر بولیں ۔" اے بیوہ کی شادی ہوئی تو کیا غضب ہو گیا۔ دولہن کے پاس سے پھولوں کی لپیٹیں نہیں آتیں تو، دولہن ۔ دولہن نہیں لگتی ۔ یہیں گھر میں موتیا کے پودے لگے ہیں ایک گجرا ہی گوندھ لاؤ ۔"

ہر طرف چاؤں چاؤں ہونے لگی ۔ "اے توبہ ہے، ایسا بھی کہیں ہوا ہے ؟"

"اے نا بی ۔ یہ کبھی ممکن ہے ۔ ؟"

"چلو، بی، مت تو ماری نہیں گئی ۔ بھلا چڑھاوے میں پھول چڑھیں گے ۔"

زہرہ کا دل اس کے پہلو میں نہیں کہیں اور دھڑک رہا تھا ۔ اسے اپنے آس پاس موتیا کے پھولوں کی جھالریں محسوس ہو رہی تھیں اور زہرہ ان جھالروں میں ایسی الجھی کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

رات کے تین بجے جب بڑے دروازے سے زہرہ کا جنازہ نکلا تو جہیز کے کمرے میں روپہلی اور سنہری طشتوں میں چمکیلے کپڑے اور زیورات بڑے جگ مگ جگ جگ کر رہے تھے۔ اور زہرہ کے بدن پر صرف موتیا کے ہلکے پھلکے پھول تھے ۔ مہکے ہوئے گجرے تھے جو اس کے چڑھاوے میں نہیں آئے تھے ۔

رنگِ حنا

"اے ہے بی بی جی — آپ کے ہاتھوں کو مہندی کی کون ضرورت ہے۔ یہ سرخ سرخ ہتھیلیاں تو آپ ہی مہندی سے رنگی رنگائی جان پڑتی ہیں —" بوا نے بڑی سچائی اور بھولپن سے شمیمہ کے حسن کا اعتراف کیا۔ اختر جو ذرا دور کونے میں اس گول بڑا اور شور شرابے سے ہٹ کر اخبار "ٹائمز" میں الجھ گیا تھا۔ چونک سا پڑا۔ اس نے اخبار کے کھڑکھڑاتے صفحوں کو ہٹا کر ذری دیر کچھ جھانکا اور بڑے اچنبھے سے پوچھا۔

"بوا جی — یہ کس کی حنائی انگلیوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔"

شمی جل گئی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بڑی بے پرائی سے اور مغرور سی نگاہوں سے اس نے اختر کو یوں دیکھا جیسے۔" ہونہہ تم کیا سمجھتے ہو مجھے"۔

یہ بوا سنا رہی تھیں۔ اے میاں یہ اپنی شیمہ بی بی کے ہاتھوں کی بات کہہ رہی تھی کہ ایسی سرخا سرخ ہتھیلیوں کو بھلا مہندی کی کون حاجت ہے بیٹا سنگار پٹار تو اس کو بھاوے ہیں۔ جنھیں اللہ نے صورت نہیں دی۔ بٹیا تو چاند کی طرح سے جم جماتی ہیں۔"

شمیمہ اس تمام عرصہ میں بن بنا کر جان جان کر ہتھیلیوں پر مہندی کی تہیں جماتی اور رہ رہ کر اختر کی طرف دیکھتی رہی۔ اختر کو ہنسی آگئی

"اوہ۔ یہ لڑکیاں خدا کی قسم۔ ذرا ان کی تعریف کر دی جائے پھر دیکھو ذرا کیا بنتی ہیں۔"

شمیمہ اختر کی ہنسی پر تلملا کر بولی،" آپ کو بن بات کی ہنسی کیوں آتی ہے جناب۔ ایسے سے پاگلوں میں شمار ہونے لگے گا۔ جی ہاں!"

اختر سراسر ہیر دین کر بولا۔" ایسے بھی کون پاگلوں سے کم ہیں ہم ع
"ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکے۔" وہ بڑی بے باکی سے گنگنانے لگا۔

عورت کتنی ہی بھولی رہے۔ عشق کے اشارے سمجھتے اسے ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ سمجھ گئی کہ اختر کے شعر کا مخاطب کون ہے۔ مگر ذرا بن کر ذرا مسکرا کر بولی

"ہوش و حواس و عقل تو اے داغ جا چکے
اب آپ کب جانے والے ہیں سامان تو گیا

اختر پھڑک گیا۔ "بات پتے کی کہی ہے آپ نے شمیمہ بیگم ۔ اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا۔ مگر یہ بتایئے کیا ہمیں تنہا ہی جانا پڑے گا۔ یا کوئی حسین ساتھی ہمارا ساتھ دے گا۔ ورنہ ویرانوں میں کیا دل لگے گا؟"

اختر نیا نیا انجینئر ہوا تھا اور حکومت کی طرف سے بالکل جنگل باڑی میں اس کا تقرر ہوا تھا۔ چند دن تو ڈیوٹی پر چڑھنے میں باقی ہی تھے۔ ان میں خالاؤں ممانیوں، پھوپھیوں سب سے نپٹتا پھر رہا تھا۔ آجکل وہ چار دنوں کے لئے ماموں، ممانی کے ہاں اڈہ جمائے ہوئے تھا۔ ماموں تو خیر اپنے ہی تھے مگر ممانی جو پرائے گھر کی تھیں اور روپے پیسے سے میکے سے بھی خوش سسرال سے بھی خوش ۔ ذرا اکڑی، ٹکڑی پھرتی تھیں۔ اس پر خوبی یہ کہ خدا نے اولادیں ایسی حسین حسین دے رکھی تھیں مانو چاند تاروں کا بن انہی کے آنگن سے کھل اٹھا تھا ۔ ایسی پیاری پیاری صورتیں دیکھنے میں آتیں کہ انسان ذری دیر کو سوچتا رہ جائے کہ حوریں اور غلمان بھلا ان چاند تاروں سے زیادہ اور کیا حسین ہوتے ہوں گے۔؟ شمیمہ سب سے بڑی تھیں اور پہلی تاریخ کے چاند کی طرح سارا حسن ساری نزاکت اور البیلاپن سمیٹے ہوئے تھیں۔

خاندان بھر میں یہ بات مشہور تھی کہ جتنے پیام اب تک شمیمہ بیگم کو آچکے ہیں اتنے ساری لڑکیوں کو بھی ملاکر نہ آئے ہوں گے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اگر اتنے پیام نہ آتے تو واقعی حیرت کی بات تھی۔ کون بات کون خوبی، کون گن بی شمیمہ میں نہیں تھا۔ تعلیم بھی بی، اے کر چکی تھیں ایم، اے کرنے کا بہت کہا، مگر باپ لاکھ روشن خیال تھے۔ لڑکے لڑکیوں کی

مخلوط تعلیم کے قائل نہ تھے اور شہر میں جو سب سے بڑا کالج اور یونیورسٹی بھی اس کمبخت حکومت نے یہی چلن چلا رکھا تھا کہ لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ عشق کے کھیل کھیلیں اور انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور یوں ماں باپ کے بولنے بتانے پر بٹیا نے دھیان دیا تو خود بھی سوچا کہ اب بی اے بھی کچھ ایسی حقیر ڈگری تو ہے نہیں جو میں کڑھتی پھروں ۔

شمیمہ بیگم پر جنگلی بیروں کی طرح ایسے ٹپا ٹپ پیام آئے کہ ماں باپ کو کچھ سوجھی ہی نہیں ۔ پہلے تو کوئی زمانے تک یہی بہانہ کام آتا رہا کہ لڑکی پڑھ رہی ہے ۔ پڑھ رہی ہے ۔ چلو پڑھائی کا بہانہ ختم ہوا، تو عام ماں باپ کی طرح یہ جملہ زبان پر آتا چلا گیا ۔ " اونہہ ایسی بھی جلدی کیا ہے ۔ " کسی عقل مند کو تو یہ نہ سوجھا کہ ارے کمبختو لڑکی کی عمر میں بھی جلدی اور دیری کو سوچا جاتا ہے ۔ یہ تو ایسی بیل ہوتی ہے کہ بس چڑھی تو چڑھی ہی چڑھی ۔ شمیمہ کے حسن نزاکت اور پیاموں کی افراط کو دیکھتے ہوئے یہ کبھی کسی نے سوچا ہی نہیں کہ لڑکی کی ایک خاص عمر ہوتی ہے جس میں اسے پیام آتے ہیں تو ٹوٹ ٹوٹ کر، جیسے شدید ژالہ باری میں برف کے گولے گر رہے ہوں اور جب برا وقت آتا ہے تو دور اونچی ہوائیں، اونچی پتنگ کی طرح بس اڑتے چلے جاتے ہیں ۔ مگر شمی کے حسن، اوصاف اور تعلیم کے ساتھ ساتھ پیسے کو دیکھتے ہوئے ایسا سوچنا تو حماقت ہی تھا کہ اسے بھی کبھی پیاموں کے لئے ترسنا پڑیگا

شمیمہ کا حسن چڑھتے چاند کی طرح چمکا اور مشہور ہوا تو کانوں کی ایسی وہ بھی ہٹ تو نہ تھی کہ یہ نہ سمجھتی کہ میری بھی کوئی ہستی ہے یا نہیں ۔

۔ ہر آئے گئے کے سہیلیوں، بہنوں، ملنے جلنے والوں کے منہ سے سُن سُن کر اسے بھی اپنے حسن کا ایسا شدید احساس ہوا کہ بھولے سے بھی اب وہ کسی مرد کو خاطر میں نہ لاتی ۔ اپنے کنوارپن پر نازاں وہ خود کو کنول کی بے داغ کلی سمجھتی اور اپنی جان پہچان والی سہیلیوں، رشتے کی بہنوں کی شادی میں جاتی تو انھیں بڑی کراہت اور نفرت کے ساتھ چالی ٹ ہوئی ہانڈی کے خطاب سے نوازتی ۔ عقل کی کوری تو نہ تھی ۔ مگر یہ کبھی بھول کر بھی نہ سوچا کہ پھر خدا نے آدم کی پسلی سے حوا کو کیوں نکالا ۔ اور یوں عورت مرد سے کٹی کٹی رہتی تو دنیا ایک رنگ برنگے بہار بھرے باغیچے کی طرح نظر کیسے آتی ۔

شمیمہ کے باپ ڈپٹی کمشنر تھے ۔ حکومت سے کار بنگلہ، چپراسی، سبھی کچھ ملے ہوئے تھے اور پھر گھر کا بھی پیسہ کچھ کم نہ تھا ۔ بڑھیا زندگی کے ٹھاٹھ باٹ سارے کے سارے میسر تھے، لڑکے لڑکیاں، عیش و عشرت میں پلے پلائے تھے ۔ کسی بات کی کمی نہ تھی ۔ خدا نے انھیں اتنا دے رکھا تھا کہ چار کو کھلا کر کھا سکتے تھے، بہن بیچاری ایسے معمولی گھر پڑی تھیں ۔ گو میکے میں جب تک کنواری رہیں گھر کی امیر ہی کہلائیں اور جب بیاہ کر اپنے میاں کی گھر بار کی ہوئیں تو جیسا کہ دنیا کا دستور ہے ۔ سسرال ہی سے عورت کا ناطہ ہے ۔ ایک عُسرت زدہ زندگی ان کا مقدر بنی ۔ اور خدا نے بیگن کے بیجوں کی طرح اولاد بھی خوب پیٹ بھر کر دی تھی ۔ بڑے لڑکے اختر نے شاندار نمبروں سے سارے لڑکوں کا ریکارڈ توڑ بی ایس سی کیا تو حکومت نے وظیفہ دیا ۔ پڑھائی کے لئے ماموں کے شہر ہی آنا پڑا ۔ تو یہ بات ماموں

کو گوارا نہ ہوئی کہ ان کے ہوتے لڑکا ہوسٹل میں پڑھے۔ دو چار برس کی بات ہی کیا ہوتی ہے بھلا۔؟ ماموں کے اصرار پر اختر آ تو گیا۔ لیکن اب یہ اس کے جی کو معلوم ہوا کہ ممانی کیسی زہر کی پڑیا تھیں ــــ اسے حیرت تو یہ ہوتی کہ وہ ایسا کوئی چھوٹا موٹا بچّہ تو نہ تھا جس سے زور زیادتی کر بھی لی جائے تو وہ منٹوں ہی میں بھلا دے۔ اچھا خاصا مرد تھا۔ جس کے ذہن پر جو بات پڑتی نقش ہو کر اُٹھتی۔ سب سے زیادہ ہنسی تو اسے اس وقت آتی جب وہ دیکھتا کہ کھانے کی میز پہ اچھی اچھی ڈشز وہ اپنے بچّوں کی طرف بڑھا دیتیں ــ انڈے، گوشت، مرغ، ملائی سب ادھر ہی ادھر ہٹتا جاتا۔ اور پھر بڑے اصرار سے دال اور سبزی بڑھا بڑھا کر بولتیں کہ "میاں تم تو کچھ بھی نہیں کھا رہے ہو۔ ایسے سے کچھ طاقت رہے گی۔؟"

ہوسٹل کی زندگی یقیناً اس زندگی سے بری ثابت نہ ہو سکتی تھی۔ مگر اختر کو ماموں کی بات کا پاس تھا۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اس گھر میں اس کے لئے بس ماموں کا دم ہی غنیمت تھا۔ باقی تو سب اپنی اپنی امارت اور خوشیوں کے نشے میں چور تھے۔ کیسی بے ڈھب بات تھی۔ مگر ایسے ماحول میں، اختر کی نگاہ انتخاب پڑی بھی تو کس پر۔ وہ جو سبھوں میں یوں چمکتی تھی مانو تاروں میں چاند۔ جس کی طرف دیکھنے کے لئے نگاہ کو اتنا اونچا اٹھانا پڑتا تھا کہ گردن درد کرنے لگے۔ برسات کی جھم جھم کرتی رُت میں ایک رات جب کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی اور اس نے بے دھیانی میں دروازہ کھول دیا تو ایک ننھا منا خوبصورت وجود تھا جس کے ترکش میں تیر کمان تھے اور آنکھیں نور سے بے بہرہ۔

بے چارہ اندھا دیوتا کیوپڈ — اسے کیا پتہ اس کا نشانہ کون ہے ۔؟
اس نے کمان سے تیر جوڑا اور سن کر کے جو چھوڑا تو سیدھا اختر کے دل میں جا چبھا ۔ اختر کو چیخنے کی مہلت نہ ملی ، ۔" ارے یہ کیا کرتے ہو بھائی" مگر وہ پلٹا ۔ اندھیری رات کے شرابور سناٹوں میں گم ہوتے ہوئے اس کی من موہک اور سریلی آواز جگر کو آگ لگا گئی ۔" میں تو اندھا ہوں ۔ مجھے کیا پتہ میرے تیروں کا نشانہ کون کون ہے ۔ یہ تو میری عادت ہے اور میں تیر چلانے پر مجبور ہوں ۔ مجھے معاف کر دو بھائی ۔"

وہ برسات کی بڑی ظالم رات تھی ۔ اختر یونان کی لوک کتھائیں پڑھتے پڑھتے وہیں آرام کرسی پر لڑھک پڑا تھا ۔ کہ دروازہ کھلا اور شمیمہ بڑی تیزی اور تندہی سے داخل ہوئی تھی ۔ اور اس کی نیند کا لحاظ کئے بغیر بڑی ترشی سے اس کے سینے پر سے کتاب اٹھاتی ہوئی بولی ۔

" واہ بڑے پڑھنتو بنتے ہیں نیندیں تو دھت ہیں اور" دغاباز کیوپڈ دغا دے کے بھاگا " سینے پر ڈال رکھی ہے ۔" اختر بڑبڑا کر اٹھا ۔ کتاب بیچوں بیچ اس جگہ کھلی پڑی تھی جہاں سے وہ عشق کے دیوتا کا بیان پڑھ رہا ۔ کتاب اٹھا کر شمیمہ جانے لگی تو اختر نے بہت کچھ کہنا چاہا مگر اس کی گویائی سلب ہو کر رہ گئی ۔ کیوں کہ جاتے جاتے اس مغرور اور بے پرواسی لڑکی نے بالکل بچوں کو ڈرانے والے انداز سے انگلی اٹھا کر کہا تھا ۔

" چھی چھی چھی ۔ کالج کے لڑکے ایسی عشق و محبت کی باتیں نہیں پڑھا کرتے ۔ یوں اخلاق خراب ہو جاتے ہیں ۔"

اس سمے اس کی آنکھیں اس قدر معصوم اور خوبصورت لگی تھیں کہ اختر کا جی چاہا تھا کہ گناہ ثواب، مذہب و ذہب اخلاق و اطوار کے تمام بندھن توڑ کر اسے چوم لے ۔ اس کی آنکھوں کو اپنے ہونٹوں سے ڈھانپ لے مگر وہ صرف سوچ سکا ۔ "ڈپٹی کمشنر کی بیٹی ۔ تمہارے جسم پر اصلی جاپانی سلک کی ساری سل سل کر رہی ہے ۔ تمہارے کمرے کے پردوں کا کپڑا پینتیس روپے گز کا ہے ۔ تمہارے پپا کی کار سورج کی طرح چم چم چمکتی ہے اور تم جب سو کر اٹھتی ہو ۔ تو تمہارا نوکر بیڈ ٹی لئے پہلے ہی سے حاضر رہتا ہے ۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اپنی اس معصوم اداؤں کے ساتھ تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ ۔ اور میں ؟ ۔ بہتر یہ ہے کہ میں بھی کہیں چلا جاؤں ۔" !

اس نے بڑی بے بسی سے سوچا ۔ اس زمین آسمان کی حدود سے پرے، جہاں کہیں بھی میں چلا جاؤں ۔ کیا واقعی تمہاری یادوں سے بھی چھٹکارا پا جاؤں گا شمی ۔ ؟"

وقت نہ تو پر لگا کر اڑا ۔ نہ تو دلہن کی طرح خراماں خراماں گزرا بس جس طرح کہ چوبیس گھنٹوں کے دن رات چوبیس گھنٹوں میں ہی گزرتے ہیں ۔ ایسے ہی ماہ و سال اپنی رفتار سے گزرے کیونکہ وقت کو تو گزرنا ہوتا ہے : اور خدا جس نے ہر چیز کو حرکت پذیر رکھا ہے ۔ سب کو اپنے مقررہ قاعدے سے حرکت دیتا رہتا ہے ۔ سو یہ تین سال بھی گزر ہی گئے اور ہر چند کہ اختر اور اس کی امی کو یقین تھا کہ آس لگانا بڑی حماقت ہے

جہاں سے انکار کے ٹھیکرے ہی ملیں ۔ پھر بھی انھوں نے شمیمہ کے لئے اختر کا پیام دے ہی دیا ۔ ممانی جان نے ایک ہلکی سی طنز زدہ " ہونہہ " والی مسکراہٹ سے اپنا غصہ ظاہر کر دیا ۔ کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ شمیمہ کے لئے ڈاکٹر ۔ انجنیئر ، کمشنر ، بیرسٹر کوئی ایسا نہ چھوٹا تھا جس کا پیام نہ آیا ہو تو ، بھلا بیچارے اختر کو کہ بقول ممانی جان " ان ہی کے گھر کا پروردہ تھا کون تولنے چلا تھا ۔ ؟ ؟

مگر یہ اختر کی سعادت مندی تھی ۔ یا عشق کی انتہا کہہ لیں کہ انکار ۔ اور پھر پورے انکار کے باوجود بھی ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے ماموں ممانی سے ملنے چلا آیا تھا ۔ اس کے دل کو نہ جانے کیوں یقین تھا کہ یہ انکار صرف ممانی کی طرف سے ہے ۔ جیسا کہ ہر شوہر بیوی کی بری بھلی سنتا اور سر جھکاتا ہی ہے ۔ ماموں بھی چپ رہ گئے ہوں گے ۔ مگر یہ ماننے کو اس کا جی تیار نہ ہوتا تھا کہ یہ انکار صرف شمیمہ کی طرف سے بھی ہے ۔ دو دن بعد عید پڑتی تھی ۔ ماموں نے اصرار سے روک لیا تھا اور اسے رکنا ہی پڑا تھا ۔ ان دو دنوں میں وہ انکار کی ذلّت سے دوچار ہو جانے کے بعد بھی چھیڑ چھاڑ سے ہیر پھیر سے تنہائی میں موقع نکال کر شمیمہ سے پوچھ لینا چاہتا تھا کہ واقعی میں تمہارا اہل نہیں ہوں ۔ ؟ ؟

ادھر عید کا چاند دیکھا اور عید کی دھوم دھڑکا شروع ہو گئی کپڑے نکل رہے ہیں ۔ مہندی بھگوئی جا رہی ہے ۔ کسی کے دوپٹے پر ادھورا گوٹا ٹنکا تھا وہ پورا کیا جا رہا ہے ۔ کسی کے غرارے کی سنجاف پر چمپا ٹنک رہا ہے ۔ یوں لگ رہا تھا کہ صبح ہو گی ہی نہیں ۔ سارے کام

اسی لمحہ پٹنگ ٹئے جا رہے ہیں - دالان میں سو سو کینڈل پاور کے بلب لگا کر رات کو دن میں بدل دیا گیا ہے - سفید چاندنی بچھا کر بوا ساری لڑکیوں کے مہندی لگانے بیٹھ گئی ہیں - گوری گوری سانولی سلونی - گلابی، سرخ پیپل کی طرح ملائم چکنی اور کومل ہتھیلیاں گھنٹے دو گھنٹے میں شفق رنگ ہو جائیں گی - اختر کو ایسے موقعوں پر بڑا مزہ آتا - گھر کے اور لڑکے بالے جب اپنی ہی تیاریوں میں مگن رہتے - اپنے گھر پر بھی اور اب یہاں ماموں کے یہاں بھی، وہ بیٹھا لڑکیوں عورتوں کی چیخ و پکار، دھوم دھڑلک اور تیلریوں کے شور سے محظوظ ہو رہا تھا - اور کہنے کو برائے نام اخبار کے صفحے کھڑکھڑا رہا تھا - جس کا ایک ایک حرف وہ صبح ہی چاٹ چکا تھا -

بڑے دالان سے ممانی جان کی کراری آواز سنائی دے رہی تھی - وہ ماماؤں پر چڑھ رہی تھیں - کہ صبح ہونے میں چھ سات گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں اور ابھی نہ تو سیویاں بھون کر رکھی گئی ہیں - نہ شیر خورمے کا میوہ ہی تیار ہوا ہے - ممانی جان کے وجود کو فاصلے پر محسوس کر کے اختر نے مطمئن ہو کر اخبار کو لپیٹ دیا اور خود ہتھیلی میں ٹھوڑی ٹکا کر مزے مزے سے حالات کا جائزہ لینے لگا - اسے ایسے موقعوں پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اتنی ساری لڑکیاں کہاں سے آن ٹپکتی ہیں - ممانی جان کی ویسے تو صرف تین ہی لڑکیاں تھیں - شمیمہ، صبیحہ اور میمونہ - لڑکے چار تھے - مگر ان کا یہاں ذکر گذر ہی نہ تھا - پھر یہ اتنی دھوم دھپا کیسے مچ رہی تھی اور بے چاری بوا تھیں کہ ہتھیلیوں کے چاندوں کو چمکاتے چمکاتے انکی اپنی آنکھیں مارے نیند کے کجلائی جا رہی تھیں - مگر لڑکیاں تھیں کہ نیند کا آنکھوں میں دور دور تک

نام ونشان نہ تھا۔ مہندی بھی لگ رہی تھی۔ کل کے لباسوں کے متعلق رائے بھی لی، دی جارہی تھی۔ اور مذاق مذاق میں سربستہ راز بھی افشا ہو رہے تھے ان ہی کی باتیں سننے سے اختر کو یہ بھی پتہ چلا کہ کل عید ملنے کے بہانے صبیحہ اور میمونہ کے سسرالی لوگ بھی بات پکی کرنے آ رہے ہیں۔ شمیمہ ان دونوں سے ۳۔۴ سال بڑی تھی۔ شمیمہ کے بعد تین لڑکے تھے۔ پھر صبیحہ، پھر میمی۔ ظاہر ہے جب شمی کی ہی شادی کا اور چھور نہ تھا تو ان چھوٹیوں کو کون پوچھنے والا تھا۔ مگر بات یوں ہو گئی کہ ڈپٹی صاحب کے بڑے ہی جگری دوست ارشد صاحب کے دو لڑکے ڈاکٹری پڑھنے لندن جا رہے تھے۔ اور ارشد صاحب نے دونوں بھائیوں کو دونوں بہنوں کے لئے پیش کر کے نہ صرف اقبالی جواب مانگا تھا۔ بلکہ جلد از جلد شادی بھی مانگ لی تھی۔ اب ڈپٹی صاحب بڑے حیص بیص میں تھے کہ کیا جواب دیں۔ لڑکے بیحد معقول گھرانے کے اور روپے پیسے سے خوش تھے۔ بڑی بات یہ کہ مستقبل روشن تھا اور اس سے بڑی بات یہ کہ دونوں لڑکوں نے لپک جھپک دونوں بہنوں کو دیکھ رکھا تھا۔ اور خود ہی بڑے چاؤ سے پیام دلوائے تھے۔ ان دنوں شمیمہ بی کو پینٹنگ سیکھنے کی دھن سوار تھی۔ انھوں نے بہنوں ہی کے ذریعے ماں سے کہلوا دیا تھا کہ شوق سے آپ صبیحی اور میمی کی شادیاں کر دیں میں تو ابھی بزی (Busy) ہوں اور ماں بھی چونکہ یہ سمجھتی بوجھتی تھیں کہ بھئی شمی کو لڑکوں کا کیا کال۔ انھوں نے بول بتا کر شادیاں پکی کروا دیں۔

ارشد صاحب نہیں چاہتے تھے کہ لڑکے کنوارے ہی فارن جائیں اور وہاں سے تباہ ہو کر لوٹیں۔ شادی کر دینے میں یہ فائدہ تھا کہ مرغوں

کے پیروں میں دھاگے باندھ دیئے جیسی بات تھی، کہ کتنا بھی آگے بڑھ کر جگیں گے۔ بھریں گے مگر لوٹیں گے پھر ڈور سے بندھی کھونٹی ہی کی طرف لڑکیاں شادی کے بعد ماں باپ، یا سسرال جہاں بھی ان کا دل بہلے، بہر حال ہندستان ہی میں رہنے والی تھیں۔ اس لئے کہ اب بھی اتنی مدّت کے لئے اور اتنے خرچ اٹھا کر دلہنوں کو ساتھ تو نہیں بھجوایا جا سکتا اور یوں وقت گزرتے دیر بھی کیا لگتی ہے۔ ؟؟

ایک حسین منظر پینیٹ کر کے بی شمیمہ نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ صبیحہ کی گود میں ننھی منی گڑیا ہے — اور میمونہ وہ تو آگے ہی سیر سپاٹوں کی شوقین تھی اور فارن جانے پر جان دیتی تھی — وہ اپنے میاں کے پاس پہنچ چکی تھی

گھر میں ہنگامہ مچ رہا تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ بڑا سہانا اتفاق کہ صبیحہ بھی ۱۱ر اگست کو پیدا ہوئی تھی اور اس کی بے بی بھی بالکل اسی تاریخ کو — ۱۱ر اگست کو دونوں ماں بیٹی کی ایک ہی دن سالگرہیں پڑتی تھیں۔ صبیحہ بڑے چاؤ سے مشین پر گنگنا کر گلابی نائیلون کی پیاری پیاری جھالروں والی فراک سی رہی تھی۔ شمیمہ رنگے ہوئے نیلے پیلے ہاتھ لیے اوپر سے گزری تو یوں ہی سر راہے مسکرا کر پوچھا۔

"میں نے کہا بڑی سرگرمی سے سلائی ہو رہی ہے۔ کیا سل رہا ہے صبیحی — ؟"

"ارے باجی آپ بھی بس کمال کی ہیں۔ اپنے رنگوں کی جھوٹی دنیا میں کھو کر اس دنیا کی حقیقتیں اتنی جلد فراموش کر دیتی ہیں۔" وہ چہک چہک کر کہہ رہی تھی۔ "آج میری اور میری بے بی کی سالگرہیں ساتھ منائی

جا رہی ہیں ۔ بے بی ایک سال کی ہوگئی اور میں بائیس سال کی ۔"

شمیمہ کو ایک دم چکر آ گیا ۔ صبیحہ ۲۲ سال کی ہوگئی ۔ اس میں اور صبیحہ میں ۴ سال کی چھوٹائی بڑائی ہے ۔ تو کیا وہ انجانے طور پر چھبیس سال کی ہوگئی ۔ اسے اک دم گزرے ہوئے سالوں کی وہ چاندراتیں یاد آگئیں جب اختر یہیں تھا ۔ عید کا ہنگامہ مچ رہا تھا ۔ مہندی رچائے جانے کے سارے سلسلے کو وہ بڑی محویت حیرت اور بچوں کی سی خوشی سے تکتا رہا تھا ۔ اور جب کسی کام سے وہ اپنے کمرے میں گئی تھی ۔ تو وہ بھی لپکا چلا آیا تھا اور بڑے ہی نرم اور جذباتی لہجہ میں بولا تھا ۔

"شمی تمہیں پتہ ہے ممانی جان نے جو فیصلہ کیا ہے ۔"

شمی نے بڑے غرور اور حقارت سے میز پر پڑے ہوئے البم کی طرف ایک نگاہ پھینکی تھی ۔ جس میں اس کے لئے آئے ہوئے تمام بڑے بڑے آدمیوں کی تصویریں تھیں اور جو چھیڑ چھیڑ میں اس کی میز پر ڈال دی گئی تھیں ۔ اختر نگاہوں کی زبان سمجھ گیا اور ذرا دکھ سے بولا ۔

"یہ سب بہت بڑے بڑے لوگ ہیں شمی ۔ میں جانتا ہوں ۔ مگر آدمی آدمی، دل دل میں فرق ہوتا ہے ۔"

شمی نے اسی تلوار سے اس کو گھائل کیا ۔ "ٹھیک کہا ہے آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے ۔"

اختر جانے کو مڑا ۔ پھر رک کر بولا ۔ "مجھے پتہ ہے شمی تم قسام ازل سے لافانی حسن کی وہ سوغات لے کر آئی ہو کہ برسہا برس گزر جانے پر بھی تم ایک نوخیز کلی ہی کی طرح سرسبز و شاداب نظر آؤ گی ۔ مگر پھر بھی جیون کی لمبی راہیں

بنا ساتھی کے طے نہیں کی جا سکتیں۔ کبھی نہ کبھی تو تمہیں کسی مرد کے آگے جھکنا ہی ہوگا۔ حسن اور شباب الگ چیز ہے۔ اور ایک سے دو ہو جانے کی تمنّا اور ضرورت قطعاً الگ چیز۔" اور وہ کمرے سے ایک دم باہر نکل گیا تھا اور آج اتنے سال گزرنے پر بھی پلٹ کر نہ آیا تھا۔ اس وقت شمی کو مگر یہ سوچ کر بے حد سکون ملا کہ اختر ہی کے الفاظ میں وہ لافانی حسن کی سوغات خدا سے لے کر آئی ہے۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ مگر آج تو جیسے انہونی باتیں شرط باندھ کر اس کا امتحان لے رہی تھیں۔ رات کو سالگرہ کے ہنگامے میں کئی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں اس کی ایک نہایت بے تکلف سہیلی نے جو اب تین بچوں کی ماں ہو چکی تھی، ہنس کر اس سے پوچھا۔

"بھئی شمی — یہ کیا خرافات ہے کہ چھوٹی بہنیں بال بچوں والی ہو گئیں اور آپ ابھی تک یوں ہی بیٹھی ہیں۔"

آخر کب کرو گی شادی وادی۔"

وہ ہڑبڑا کر بولی —"بھئی اصل میں میں نے پرائیوٹ ایم اے پریویس کر لیا ہے۔ سوچ رہی تھی کہ فائنل بھی نکال لوں۔ پھر سوچا جائے گا"

"اور تب تک تمہارے حسن کے خریدار تمہارے منتظر ہی تو رہیں گے جیسے — بھئی یہ بن بات مدتوں کنواری رہنے کی تُک تو اپنی سمجھ میں نہیں آتی — ہاں جہاں پیاموں کی، حسن کی، تعلیم کی، دولت کی مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔ تمہیں تو خدا نے ہر چیز سے نوازا ہے۔ اور پھر بھی راہباؤں کی سی زندگی گزار رہی ہو — بس اب کر ہی ڈالو شادی —"

لیکن جب اس نے سنجیدگی سے اس معاملہ پر اکیلے میں سوچا تو یہ سوچ کر سخت فکر مند ہوئی کہ آخر وہ اس دبی ہوئی بات کو اب کیسے اٹھائے۔ اتنی آزادی اور روشن خیالی اس گھر میں تھی نہیں کہ وہ ماں سے جا کہتی کہ میری شادی کر دیجئے۔ چھوٹی بہن سے کیسے کہتی؟ سہیلیوں سے کہتی تو نکّی نہ بن جاتی۔؟ اور اب اس پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ شمع پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے والے پتنگوں کی طرح وہ سارے پیام تو اب ماضی ہی بن کر رہ گئے کیوں کہ اتنے سارے سالوں میں تقریباً سبھی لڑکوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ اسی لمحے اسے اختر کا خیال آیا۔ اور اختر کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے دل کو سخت تکلیف اور اذیت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ جو اتنی اونچی تھی کہ آسمان پر بیٹھ کر سب کو حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔ اب ایسے ویسے لوگوں کے بارے میں بھی سوچنے لگی تھی۔ لیکن تلخ تر حقیقت یہ تھی کہ اختر بھی انگیج ہو چکا تھا۔ بھائی بہن کی خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ پھوپھی اماں نے سرسری ایک اطلاع دے دی تھی کہ اختر کی بات بھی ایک جگہ پکی ہو گئی ہے لڑکی والے بیس ہزار نقد بھی دے رہے ہیں۔ خود اختر کا چونکہ یہ ارمان تھا کہ دلہن کو اپنی کوٹھی میں اتارے اس لئے یہ شادی رکی ہوئی ہے۔ حکومت سے قرض لے کر وہ شاندار گھر بنوا رہا ہے۔ اسی لئے شادی میں دیر ہے۔ ورنہ سب خیریت ہے۔ اور خدا کا فضل ہے کہ اس نے اتنا نوازا ہے کہ اب بیٹے میاں کے پاس کار بھی ہے۔

وقت کے تیز رفتار پرندے نے چند قلانچیں اور بھریں۔ شمی کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا کہ جس سے دل بہلا سکتی۔ ایم، اے

فائنل تو وہ کر ہی چکی تھی ۔ ماں نے بہت دھائیں مچائی کہ ہمارے خاندان میں آج تک کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی اور ہمیں ضرورت بھی کیا ہے مگر شمیمہ ایک کالج میں لکچرر ہو گئی ۔ اب تک اس نے کس بے فکری سے زندگی گزاری تھی ۔ مگر وقت کے ایک ہی لمحے نے سالگرہوں کے اس چمکیلے دن نے اس کو اجالوں سے اندھیروں میں گھسیٹ لیا تھا ۔ جب اپنا دل ہی اداس ہو تو رنگین سے رنگین واردات بھی پھیکی پھیکی نظر آتی ہے ۔ وہی تو گھر تھا وہی بھائی بہن وہی ہنگامے ۔ مگر شمیمہ سب سے کٹ کر رہ گئی تھی کاش گزرنے والے دن بھولے بسرے ہی سہی ایک آدھ بار ہی اس کے کانوں میں تنبیہ کر جاتے کہ "شمیمہ بیگم ، حسن جوانی ، دولت تعلیم ، عزت سب اپنی جگہ ٹھیک مگر یہ نہ بھولو کہ عورت کی زندگی کا ۔ عمر کا ایک خاص دور ہوتا ہے جس کے گزرنے کے بعد وہ سب کی نظر سے اتر جاتی ہے ۔" تو وہ شائد اس طرح لاپروائی سے وقت نہ گنواتی ۔ زندگی کی دوڑ میں سب آگے بڑھ گئے ایک وہی تنہا رہ گئی ۔ کیسی اندھیاری رین ہے معبود ۔ کیسا گھنا اندھیرا کہ حسن کی دمادم ۔ چمکتی کوندتی بجلیاں بھی اس میں روشنی کا ہلکا سا سایہ تک نہیں پیدا کر سکتیں !!

∴

اختر کو کھانے کی میز پہ بیٹھے بیٹھے بے طرح ہنسی آ رہی تھی ۔ یہ ہنسی وہ ہنسی نہ تھی جو دل کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے ۔ یہ طنز میں لپٹی ہوئی تھی ۔ ممانی جان یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں بکا ہوا مال ہو چکا ہوں ۔ کس طرح میری خاطر مدارات کر رہی ہیں ۔

"میاں یہ مرغ تو چکھو ۔ ارے انڈے تو تم نے لئے ہی نہیں ۔ ارے بیٹا تین دن کا آنا بھی کوئی آنا ہوتا ہے ۔ کہ خاطر کرنے کی حسرت ہی دل میں رہ گئی ۔ یہ شاہی ٹکڑے تو تم بہت شوق سے کھایا کرتے تھے ۔ اور یہ ماش کی گھی میں ڈوبی ہوئی دال تو تمہیں بہت پسند تھی نا ۔"

اس کے دل سے دھواں سا اٹھا ۔ پسند ناپسند کی بات چھوڑیئے ممانی جان اپنی زندگی میں انسان کیا کیا پسند نہیں کرتا ۔ پھر کیا ہر چیز اسے مل ہی جاتی ہے اس گھر میں اور بھی تو کئی ساری چیزیں مجھے پسند تھیں تب تو آپ نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور اب ۔؟ اس نے یہ سب دل ہی دل میں سوچا اور بظاہر کھانے میں منہمک رہا ۔

تین دن کے ننھے منے عرصے کے لئے اختر شائد اس کا صبر آزمانے آیا تھا ۔ یا پھر یہ دیکھنے کے لئے کہ لافانی حسن کی سوغات کی اہل وہ عورت اب ماہ وسال گزرنے پر بھی وہی کشش رکھتی ہے یا وقت نے اپنے بے رحم ہاتھ یہاں بھی پہنچا دیئے ہیں ۔!!

اس نے تنگ آکر یہ طے کر لیا تھا کہ کنواری رہ کر وہ زندگی گذار لے گی، مگر یہ اس کا اپنا فیصلہ تھوڑی تھا جو خوشی خوشی کیا گیا ہو ۔ یہ تو مجبوری کا فیصلہ تھا ۔ کیا ایک سے دو ہونے کی تڑپ اس کے دل سے نکل گئی تھی ۔ خوشیوں کے فیصلے تو چہرے پر خود اعتمادی پیدا کر دیتے ہیں ۔ یوں شرمساری کی کیفیت کہاں رہتی ہے ۔ ورنہ اس کا چہرہ یوں بجھا بجھا رہتا ۔ اور وہ جو کہ سدا سے سر اٹھا کر چلنے کی عادی تھی ۔ وہ ؟ ۔

"ارے آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی ۔" اختر بڑے کھٹور پن سے بولا

وہ کچھ نہ بول سکی ۔ بڑی زخمی نگاہوں سے اختر کو دیکھ کر رہ گئی ۔ وہ تو سوکھی مرجھلی شاخ ہوکر رہ گئی تھی ۔ اور اختر ۔ کس طرح اس کے چہرے سے بہار پھوٹ رہی تھی ۔ جسم پہلے سے زیادہ بھر گیا تھا ۔ رنگت بھی نکھر گئی تھی اور خود اعتمادی کا وہ عالم تھا جیسے ساری دنیا کو پاؤں تلے مسل کے رکھ دے گا ۔

"آپ بھی تو کنوارے ہی ہیں ۔" ایک بے تکا سا جملہ اس کے منہ سے نکل گیا ۔"

"بس اب گھر بن گیا ہے ۔ اب چند دنوں کی بات ہے ۔ میرا بڑا شدید ارمان تھا کہ اپنی دلہن کو ذاتی خوبصورت چھوٹے سے گھر میں اتاروں ، خدا سے ہمیشہ اچھے دنوں کی آس رکھنی چاہیئے ۔ وہ ہر دعا سنتا ہے ۔ بس اب یہاں سے جاکر شادی ہی تو کرنی ہے ۔ باقی سب مرحلے طے ہو چکے ہیں ۔"

وہ کس قدر کٹھور ہو گیا تھا ۔ کیا وہ بھول گیا کہ وہ کس طرح وہ اس پر مرتا تھا اور آج ۔ وہ اس کا جی جلانے آیا ہی کیوں تھا ۔ وہ جیسے کلپ کر بولی ۔

" آپ یہاں آئے کس سلسلے میں ہیں ۔" اختر نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا ۔ "مجھے جلانے ۔" اس نے جملہ بڑی مشکل سے پورا کیا ۔

تمہیں جلانے ۔ میں تمہیں کیوں جلاؤں گا بھلا ۔ میں تو یوں ہی ماموں جان سے ملنے چلا آیا تھا ۔ سوچا بہت دن ہو گئے ۔ مگر تم ناراض ہو رہی ہو تو چلا جاؤں گا ۔" وہ ایسی سعادت مندی سے اٹھا جیسے بس اب چل ہی دے گا ۔ شمی روہانسی ہو گئی ۔ اس کی آنکھیں بے بسی کے مارے

چھلک اٹھیں۔

"میں نے کب کہا کہ آپ چلے جائیں۔ آپ تو جتنے دن رہیں گے رونق رہے گی۔" اس کا ٹوٹا دل اپنی ناکام آرزوؤں کا بڑی دیر بعد اظہار کر رہا تھا۔ اس وقت جبکہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

"اچھا ۔" وہ بے حد ظالم ہو رہا تھا۔ "میں اس قدر اہم ہستی ہوں کہ میرے وجود سے رونق ہونے لگے۔"

شمیمہ کچھ نہ بولی ۔ اک دم اختر نے کچھ یاد کیا

"ارے اب تم مہندی نہیں رچایا کرتیں ۔"!

"دل خوش ہو تو ساری چہل سوجھتی ہے ۔ میں مہندی رچا کر کیا کروں؟" وہ تنک گئی۔

"ارے تمہارے دل کو کیا ہو گیا۔"

وہ چیخی ۔ "آپ میرا صبر آزما رہے ہیں ۔ میں جانتی ہوں آپ مجھ سے گزشتہ دنوں کا بدلہ لینے آئے ہیں ۔ ورنہ ۔ ورنہ آپ ۔ مجھے جان جان کر یوں نہ رلاتے ۔" وہ سچ مچ رو دی۔

وہ اس کے بہت قریب آ گیا۔ میں بدلہ لینے نہیں آیا ہوں شمی ۔ میں تو تمہیں لینے آیا ہوں ۔" وہ بھرپور سچائی سے بولا۔

غیر یقینی انداز میں ۔ یوں جیسے پاگل ہوتے ہوتے بچی ہو ۔ وہ تڑپ کر بولی ۔ "مگر آپ کی تو شادی ہو رہی ہے ۔ لڑکی والے ۲۰ ہزار نقد بھی دے رہے ہیں!"

وہ ہنسا ۔ "یہ سب جان جان کر تمہیں چڑانے کی خاطر امی سے لکھوایا

تھا۔ جانتی ہو کیوں؟ مجھے معلوم تھا کہ ایک ایک کر کے تمہارے سارے چاہنے والے اڑنچھو ہو گئے۔ اور زندگی کے اندھیروں میں تم تنہا بھٹک رہی ہو۔ میں چاہتا تھا تم مرد کی ۔۔ میری محبت محسوس کر سکو۔ ترسو۔ تاکہ یوں تم میں عورت پن کا، خودسپردگی کا جذبہ شدت سے بیدار ہو جائے۔ ۔ اور تم محسوس کر سکو کہ صرف حسن کے سہارے زندگی کی لمبی راہیں نہیں بتائی جا سکتیں ۔ میں تمہارے سوا اور کس در پہ جا سکتا تھا۔ شمی یہ تو سوچا ہوتا کبھی ۔،،!

مستقبل کے حسین رنگ اس کے پیارے چہرے پر قوس قزح بن کر جھلملائے مگر دوسرے ہی لمحہ اس کے چہرے پہ زردی کھنڈ گئی ۔ وہ سہم کر اعتراف کرنے لگی۔

"مگر ۔ مگر تم بھول رہے ہو کہ اب میں تمہارے لائق نہیں رہی۔ ۔ لوگ کہتے ہیں عورت بیس کی اور گھسی ۔ اور میں تو اب تیس کے لگ بھگ ہوں ۔ مجھ میں کیا دھرا ہے ۔" اس نے بے بسی سے اپنی ہتھیلیاں ملیں ۔" ادھر دیکھو میرے جسم کا سارا خون سوکھ چکا ہے۔"

وہ خود اعتمادی سے مسکرایا۔ "شمی کیا تم مجھے نادان سمجھتی ہو؟ کیا میں نے یہ سب نہیں سوچا ہوگا تم تو اب عمر کے اس دور میں ہو جب کہ عورت کا عورت پن تکمیل کی حدوں کو چھوتا ہے۔ اور مجھے ایسی ہی دلہن کی ضرورت ہے۔ شمی خود کو میرا اور مجھے اپنا سمجھ" وہ پیار سے ہنسا۔ اور ہتھیلیوں کی اس زردی پر اتنی غمزدہ کیوں ہو میری جان ۔ میرا پیار تمہاری زندگی میں وہ رنگ بھر دے گا جس کے سامنے مہندی کی سرخی بھی مات ہو گئی اور اس نے گہرے پیار اور اعتماد کے ساتھ اس کے کمزور اور زرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ۔!

آئینہ

صوفیہ ۔ صوفیہ ۔ صوفیہ

سارے میں صوفیہ ہی صوفیہ باجتی تھی ۔ وہ تھی ہی ایسی پری۔ تھی تو انسان مگر خدا نے اسے ایسے بے پناہ اور انوکھے حسن سے نواز دیا تھا کہ اس پر کسی غیر انسانی مخلوق کا گمان گزرتا تھا ۔ جب وہ سولہ سال کی ہوئی تو قیامتیں ٹوٹ پڑیں ۔ ویسے تو کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ ہر لڑکی سولہ سال کی عمر میں قیامت کو دعوت دیتی معلوم ہوتی ہے ۔ مگر صوفیہ کی بات ہی اور تھی ۔ اور سب سے خطرناک بات یہ کہ صوفیہ قطعاً لاعلم تھی کہ آخر وہ ہے کیا شے ۔ اس پر اپنی بے پناہ خوبصورتی کا راز تو اس

وقت کھلا جب وہ ایک دن اپنی سہیلی کے ساتھ اسکول سے واپس آ رہی تھی کہ زن سے ایک خوبصورت کار بازو سے گرد کے بادل اڑاتی نکل گئی۔

کار میں ایک بدصورت سی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

اس کی سہیلی زور سے ہنسی —

"صوفیہ تم نے یہ کار دیکھی۔"

"ہاں دیکھی تب ؟"

"اور اس میں بیٹھی ہوئی جو خاتون تھیں انھیں دیکھا۔"

"ہاں دیکھا تب ؟"

"بھلا وہ اس کار میں سجنے لائق تھیں۔ خدا کی قسم کار سجنے لائق تو بس تم ہو — ایسی دندناتی سواری میں بیٹھی تم کسی ملکہ سے کم کیا لگو گی۔ میرا بس چلے تو کاروں میں کسی بدصورت عورت کو نہ بیٹھنے دوں۔ یہ سواری تو بڑی خوبصورت شے ہے اور اس میں بس حسینوں کو ہی بیٹھنا چاہیئے۔ جیسی کہ تم ہو —"

صوفیہ نے بڑے اچنبھے سے ساری بات سنی۔ اس کا دماغ جیسے سنسنا اٹھا۔

"بھلا یہ کار ملتی کتنے کی ہو گی —؟"

سہیلی بڑی حقارت سے ہنسی۔

"ابا ایک موٹر گیرج میں کام کرتے ہیں — انھیں سب بھاؤ تاؤ، معلوم رہتا ہے۔ نئی گاڑی ہو تو تیس چالیس ہزار میں آتی ہے۔ ذرا پرانی ہو تو بیس پندرہ میں — اور ذرا گھسی گھسائی ہو تو دس ہزار تک

مل جاتی ہے۔" وہ ہنسی۔"یہ گاڑیوں کا سارا معاملہ عورتوں کا سا ہے نا۔"

"باپ رے۔ دس ہزار!۔" صوفیہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ پھر جیسے خواب میں بڑبڑائی۔"میں کیسے لے پاؤں گی پاپا جی کی تنخواہ تو کل ڈیڑھ ہی سو روپے ہے۔"

سہیلی ہنسی اور ہنس کر چپ رہ گئی اور یوں یہ موضوع ختم ہو گیا مگر گھر پہنچ کر جب صوفیہ نے آئینہ دیکھا تو دم بخود رہ گئی۔ باپ رے کیا سچ مچ وہ اتنی حسین تھی۔ پھر اس کی نظروں میں وہ کار گھوم گئی جو زن سے اس کے بازو سے نکل گئی تھی۔ سلور گرے کلر کی وہ شاندار کار۔ سچ مچ صوفیہ تھی بھی اسی لائق کہ ایسی ہی کار میں بیٹھ کر سیر کیا کرے۔

بڑا غضب تو اس وقت ہوا جب صوفیہ بیاہ کر سسرال آئی۔ شادی کی وہ پہلی رات۔ جب ارمان بھرے دولہا دل و جان۔ایمان تن من دھن، سب کچھ نثار کرنے۔ سب کچھ کر گزرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ مگر کمبخت کرتے کراتے کچھ بھی نہیں۔ بس دل میں پھانس چھوڑ دیتے ہیں کہ۔"تم۔ تم' جو آسمان کا چاند ہو۔ میرے لائق کہاں تھیں لیکن میرے نصیب دیکھو کہ خدا نے یہ چاند میری جھولی میں ڈال دیا۔ تم تو ایسی ہو کہ کسی کار والے سے بیاہی جاتیں۔ دو سو روپے پانے والے سے تم کیا خوشیاں سمیٹ سکو گی۔!"

صوفیہ کا شوہر بڑی چاہت اور لگن سے کہتا گیا اور صوفیہ کان بنی سنتی رہی۔ پھر اس نے بے حد محبت سے اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں

ہیں تھام لیا۔

تم اس قدر خوبصورت ہو جان ۔ کہ کہ ۔" اس کا حلق گھٹکنے لگا آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ صوفیہ نے اپنے مہندی بھرے پاؤں سکوڑے۔

"یہ پاؤں ۔" وہ گیلی گیلی آواز میں بولا ۔ خدا کی قسم یہ پاؤں زمین پر دھرنے کے لئے نہیں ۔ اتنے خوبصورت پاؤں والی کو تو بیٹھنے کے لئے کار ہونی چاہیئے ۔"

صوفیہ کا دم گھٹنے لگا ۔ کار، کار کار ۔ اس کا رواں رواں کار کار پکارنے لگا۔

صوفیہ کا شوہر کسی انگریز کرنل کے یہاں شوفر تھا۔ تنخواہ اور آنے جانے والوں کی ٹپ مِل ملاکر دو سو پڑ جاتے ۔ دل کا بڑا نرم تھا انگریز۔ اسی نرمی اور مروّت مروّت میں اس کا دل اپنی ہندستانی باورچن پر آگیا جو بعد میں اس کی میم بنی ۔ صوفیہ کے شوہر نے ایک دن بڑے پیار سے کہا۔

"صوفیہ، جان ۔ اتنی لمبی خوبصورت کار میں وہ بدصورت باورچن ذرا تو نہیں سجتی ۔ اس گاڑی میں تو بس تم ہوتیں ۔"

اور ایک دن خالی وقت میں وہ کار لے کر گھر پر آگیا۔ صوفیہ کو اس میں ڈالا اور اتنا گھمایا کہ صوفیہ کو چکر آگیا۔ مگر اس کا جی کہے جاتا تھا ابھی اور ۔ ابھی اور ۔ ابھی اور . . .

"یہ کار ہو گی کتنے کی ۔" اس نے بڑی تھکی ہوئی آواز میں یوں جیسے عُمر کی آخری منزل پر کھڑی ہو پوچھا۔

"صاحب نے تو چالیس کی لی تھی ۔ مگر اب ۳ سال استعمال کر

چکے ہیں - وہ ابھی پرسوں اپنے دوست سے کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی گاہک مل جائے تو میں دس ہزار تک دے دوں گا - اور مزید روپیہ ڈال کر نئی لے لوں گا ۔"

دس ہزار - دس ہزار -

کار اس قدر شاندار حالت میں تھی کہ دس ہزار میں قطعاً مہنگی نہ تھی صوفیہ نے بڑے اطمینان سے کہا -

" دس ہزار تو ایسے زیادہ نہیں -"

" تم لوگی -" شوہر بڑے پیار سے ہنسا -

اصل میں چالیس ہزار کے مقابلے میں دس ہزار صوفیہ کو بہت کم لگے لیکن جب اس کے شوہر نے پوچھا کہ " تم لوگی -" تو اس کا دماغ ٹھکانے آگیا - ہوش میں آکر بولی -

" میں ---؟ بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد وہ بولی -"ہاں میں لوں گی -- کیوں نہیں لے سکتی -؟ انسان ہی تو کار میں بیٹھتے ہیں میں بھی تو انسان ہی ہوں -"

وہ بڑی خوش دلی سے ہنسا -

" میری جان کے ارادے تو بہت بڑے بڑے ہیں -" اور کار شہر کی لانبی، چکنی اور چوڑی چوڑی سڑکوں کے چکر کاٹتی رہی -

❖

صوفیہ میں یکا یک ایسا بیچ آگیا کہ پائی پائی کو دانتوں سے پکڑنے لگی، کپڑے بنانے تو اس نے چھوڑ دیئے - سنگھار کا سامان اس کا شوہر

لاتا تو کہتی یہ سارا فضول خرچ کس لئے ۔ پیسے رہیں گے تو کام آئیں گے کھانے کا معیار بھی گر گیا ۔ پہلے جہاں روزانہ ناشتے میں انڈے اور شام میں گوشت سبزیاں پکتی تھیں ۔ دال پر آ کر بات ٹھہر گئی ۔ آنے جانے والوں کو اس نے چائے تک پلانی چھوڑ دی ۔ شوہر باہر سے آتا تو آتے ہی اس کی جیبیں ٹٹولنے لگتی ۔

آج تمہارے صاحب کے کسی دوست کو اس کے گھر لے جا کر نہیں چھوڑا تم نے ۔؟ پھر اس نے ٹپ نہیں دی ہوگی ؟" ۔

وہ پریشان ہو کر رہ جاتا ۔ پہلی تاریخ کا ایسی بے تابی سے انتظار کرتی کہ کنواری ، اپنے بالم کا بھی کیا کرتی ہوگی ۔ اور جب پہلی تاریخ کو اس کا شوہر جیبیں بھرے آتا ۔ تو اس بری طرح لپکتی اور جیبیں خالی کرتی کہ وہ حیران رہ جاتا اس کی بوڑھی ساس گاؤں میں اپنے دوسرے بیٹوں کے پاس تھی ۔ کھیتی باڑی سے گذر ہوتی تھی اور خاصی گزر ہوتی تھی ۔ مگر صوفیہ کا شوہر اپنا فرض جان کر ماں کو پابندی سے تیس روپے بھجوا دیا کرتا تھا صوفیہ نے وہ بھی بند کر دیئے ۔

"ر کیا پا لینے کیلئے ہمیں رہ گئے ہیں کسی کو کیا پتہ کتنی مصیبتوں سے میں گھر کا خرچ پورا کرتی ہوں ۔"

اس کا شوہر حیران رہ گیا ، آخر اتنا پیسہ وہ کیا کر لیتی ہے ۔ مگر اس نے پوچھا تک نہیں ۔ عام شوہروں کی طرح وہ دل میں شکوک پالنے کا عادی نہ تھا اور بہت صابر قسم کا آدمی تھا ۔ گوشت ملے یا کھانے میں دال ملے ۔ وہ اسی رغبت سے کھا لیتا ۔ چائے ملے یا دودھ

وہ بچوں کی طرح غٹ غٹ پی جاتا۔ لباس کا تو کوئی پرابلم ہی نہ تھا۔ صاحب کی طرف سے وردی ملی ہوئی تھی۔ وہ اکثر دیکھتا کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی دے کر آتا ہے تو صوفیہ کمرے میں گھسی کچھ کر رہی ہے۔ جیسے ہی وہ آتا وہ کھٹ سے صندوق کا ڈھکنا گرا کر باہر نکل آتی۔ اس دن سیر کرتے میں صوفیہ میں اور اس میں بات چیت ہوئی تھی اُس کو اس نے رتّی برابر بھی اہمیت نہ دی تھی۔ اور اس کے دماغ کے کسی گوشے میں اس بات کی یاد تک نہ تھی کہ صوفیہ نے موٹر لینے کو کہا تھا۔ وہ تو بھی بھول گیا تھا جیسے کہ عام شوہر بیویوں کی کہی ہوئی باتیں اکثر بھول جایا کرتے ہیں۔ مگر صوفیہ نے تو جیسے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہی یہ بنا لیا تھا کہ کار خریدے۔ دن بھر میں وہ ہزار مرتبہ اپنے جوڑے ہوئے پیسوں کو گنتی اور اس کا دل خوشی سے بھر جاتا۔ قطرہ قطرہ کر کے ہی تو سمندر بنتا ہے۔ دس ہزار جمع ہوتے تو ایسے کتنے دن گزر جائیں گے۔ لمبی کار کی کیا ضرورت ہے۔ وہ دس ہزار میں چھوٹی سی نئی کار ہی کیوں نہ لے لیگی۔ مگر جانے دس ہزار میں نئی کار آتی بھی ہے یا نہیں ابھی اتنی عام چیز تھوڑی ہوئی ہے کہ ہر کس و ناکس لے سکے۔ مانگ زیادہ ہے مال کم ہے۔ باہر سے مال آتے ہی کھٹا کھٹ بک جاتا ہے۔ مگر اسے کیا پروا۔ ایسی کون اسے ہزار دو ہزار کاریں خریدنی ہیں، اُسے تو بس ایک کار چاہیئے۔

صوفیہ اسی دھن میں مری جا رہی تھی کہ کس صورت آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے اُسے خیال آیا کہ کپڑے سی کر آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ مگر مشین تو تھی نہیں۔ صوفیہ کے ماں باپ متوسط طبقے

کے لوگ تھے جو بیٹیوں کو جہیز میں بس ضرورت کے لائق چند جوڑے اور چند برتن بھانڈے دیکر وداع کر دیتے ہیں۔ ریڈیو مشین الا بلا تو امیروں کے چونچلے ہیں مگر جب اس نے سوچا کہ مشین خریدنے کیلئے بھی تو ایک معقول رقم کی ضرورت ہے۔ تو سخت اداس ہوئی۔ بڑے دنوں کے سوچ بچار کے بعد بالآخر اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مشین خرید ہی لے۔ ویسے تو ایک ہی بار دل دکھے گا کہ اتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر روزانہ جو آمدنی آئے گی اس سے کتنا خون نہ بڑھے گا۔ ؟

مشین آگئی اور کھرر کھرر سلائی ہونے لگی، دن بھر صوفیہ مشین پر محلے ٹولے پاس پڑوس والیوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ چند دن یوں ہی گزرے کہ اچانک صوفیہ نے محسوس کیا کہ اب اس سے پہلی سی تندہی سے کام، نہیں ہوتا۔ سیتے سیتے وہ بری طرح تھک جاتی، چکر آنے لگتے۔ لیٹنے کو جی چاہتا۔ اور کھٹی میٹھی چیزوں پر دل اُمڈ آتا۔ ایک دن وہ یوں ہی سیتی بیٹھی تھی کہ اس کی ایک سہیلی آ گئی۔ وہ کئی بچوں کی ماں تھی۔ اور پھر ماں بننے جارہی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے کپڑے سلوانے کے سلسلے میں صوفیہ کے پاس آئی تھی۔ کپڑوں کا بنڈل صوفیہ کے سامنے پٹک کر وہ بڑی تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

"بچے، بچے۔ بچے۔ دم نکل گیا۔"

صوفیہ نے ذرا سا مسکرا کر سر اٹھایا۔ "کیوں بھلا؟"

وہ پھٹ پڑی۔ "کمانے والا ایک۔ کھانے والے درجن بھر۔ آج کل کے زمانے میں کچھ نہیں بنتا۔ ہر چیز مہنگی۔ پیسے والوں کی ہر دھد

ہیں چاندی - اپنی عزیب آدمی - ہار - ہار گئی تو ہیں تو -

صوفیہ نے ذرا حیرت سے پوچھا -

"ایسا کیا بچوں میں خرچ ہوتا ہوگا - اتنے اتنے سے جی کیا کھا لیتے ہوں گے بھلا -"

"یہ تو پیدا کر دتب جانو - تجربے سے پتہ چلے گا - ایک بچے کو بڑے سے زیادہ کھانا پینا لگتا ہے -" وہ ہنسی - "ایسی زیادہ دنوں کی بات نہیں چار چھ مہینے میں تمہیں خود پتہ لگ جائے گا کہ بچے کی پیدائش کیا معنی رکھتی ہے -"

اک دم صوفیہ چکرا گئی - ارے -! تو یہ بات تھی کہ اس کی طبیعت گری گری تھی - وہ اب تک بالکل معصوم تھی - ایسی ویسی باتیں اسے معلوم ہی نہ تھیں - ساس پاس تھیں نہ نند کہ - اونچ نیچ سمجھاتیں - ماں باپ کے ہاں تو اس نے جانا ہی چھوڑ دیا تھا - ریل کے کرایے میں جتنے پیسے لگتے اتنے وہ اپنے خزانے میں جمع کیوں نہ کرے -؟ اب سہیلی نے نئی سنائی وہ تو چلی گئی - مگر صوفیہ کے دل میں پھانس اٹک گئی - شام گئے اس کا شوہر آیا تو صوفیہ کو دنیا جہان کی حسیناؤں سے حسین تر پایا - حسن سوگوار تھا اور اس قدر دل موہ رہا تھا کہ بس ! اس کے شوہر نے اسے باہوں میں بھر لیا -

"میری جان تم کس قدر حسین ہو - خدا کی قسم مجھے جنت نہیں چاہیئے تم کون حوروں سے کم ہو -"

صوفیہ مغرور ہو گئی - اس کا غرور یہ سوچ کر دونا ہو گیا کہ اس ایسی حسینہ کو واقعی کاریں گھومنا ہی چاہیئے - اس نے کسی بہانے سے جا کر آئینہ دیکھا - دنیا میں آئینے سے بڑھ کر کون سچا ہے - وہ بڑی سچائی

سے اعتراف کر رہا تھا۔ واقعی صوفیہ تم اتنی حسین ہو کر محض تخیل کی پیداوار لگتی ہو۔"
سوتے سمے اس نے بہت گھما پھرا کر پوچھا۔

"کیوں بھلا بچہ ہو تو خرچ بڑھ جاتا ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں عورت پالنا ہاتھی پالنا ہے، اتنے خرچ ہوتے ہیں اس کے۔ مگر بچہ پالنا تو ہاتھی کا باپ پالنا ہے۔" وہ ہنسا۔ "کیوں؟ مجھے بچہ دو گی ایک؟"

دونوں ہنسنے لگے۔ اس کے شوہر نے ہنستے ہنستے اسے لپٹا لیا۔

"ارے پہلے بچہ ہو تو جائے۔ کمانے کے لئے ہم جو موجود ہیں۔ ابھی سے کاہے کی فکر۔"

صوفیہ کے دل کو سہیلی کی بات لگ گئی۔ اسے اپنی پھوپھی کا خیال آگیا۔ چیں چیں کرتے ہوئے کئی بچے ان کے آس پاس گھومتے، روتے بلکتے، ہمیشہ آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی کا رونا روئے جاتیں۔ اسے اس خیال سے سخت وحشت ہونے لگی کہ ایک کے بعد ایک کر کے اسے بھی دس گیارہ بچے ہو گئے تو؟ پھر بجائے اس کے کچھ جمع جتھا ہو، الٹی یہ رقم بھی ختم ہو جائے گی جو اس نے اتنی مصیبتوں سے جمع کی ہے۔ اس نے ایک انتہائی ہولناک بات سوچی۔ کیوں نہ وہ اپنا آپریشن کروا لے کہ پھر کبھی بچہ پیدا ہونے کی آس ہی نہ رہے۔؟ مگر یہ کام وہ اکیلے کیسے کر سکتی تھی۔ ہاسپٹل جانا۔ اڈمٹ ہونا، پھر آپریشن سے پہلے فارم پر شوہر کی دستخط یہ مرحلہ تو سب سے کڑا تھا۔ اس نے خود کو بے حد مجبور پا کر یہ فیصلہ کیا کہ آگے کی آگے سوچی جائے گی۔ فی الحال تو وہ یہ حمل ضائع کروا دے گی

نہ بچہ ہو گا نہ خرچہ بڑھے گا۔ دو چار دن اس نے اسی کوشش میں بتائے کبھی بڑے بڑے بوجھ اُٹھا لیتی۔ کبھی گرم ٹھنڈی چیزیں کھا لیتی۔ تین ماہ کا ننھا سا وجود معنی ہی کیا رکھتا ہے۔ ایک دن اس نے مسلسل تین چار کپ گرم گرم چائے پی لی۔ اور نتیجہ کامیابی کی شکل میں جلد ہی برآمد ہو گیا۔۔ اس کا شوہر گھر لوٹا تو اسے یوں تباہ حال دیکھ کر بے پناہ گھبرا گیا۔ دوڑ کر صاحب سے گاڑی مانگ کر لایا کہ ہاسپٹل لے جائے۔ صوفیہ نے سہم کر پوچھا

"کون سے ہاسپٹل ؟ خیراتی نا ؟"

" نہیں میں مسز آپٹے کے ہاسپٹل لے جا رہا ہوں۔ خیراتی ہاسپٹل میں کوئی خبر گیری نہیں ہوتی۔

وہ چلائی۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم تو بس یوں ہی روپیہ پھینکتے رہتے ہو میں بالکل اچھی ہوں۔ ایک دو دن میں لوٹ پوٹ کر اچھی ہو جاؤں گی۔ دیکھو خدا کے لئے۔ میری بات مانو۔ سنو تو۔"

اس نے اتنی دہائیاں دیں کہ وہ لاچار ہو گیا۔ وہ اُسے اس طرح چاہتا تھا کہ اس کی کوئی بات ٹال ہی نہ سکتا تھا۔

ہاسپٹل میں اس کا کیوریٹ ہوا۔ اتنا خون بہا کہ وہ پیلی پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے اسے اینمک قرار دیا۔ اور کہا کہ وہ بے حساب پھل، دودھ، انڈے اور طاقتور غذائیں کھلائیے۔ ورنہ صحت جواب دے جائے گی۔

وہ دل ہی دل میں ہنسی۔ ہونہہ، ایسی فضولیات پر پیسہ اٹھائے؟ اتنے پیسے جمع ہو جائیں تو۔ ؟!

اس کے شوہر کو اابارشن ہو جانے کا بیحد غم ہوا۔ وہ ایک بچے کے لئے ترس رہا تھا اور جب خدا نے یہ آرزو پوری ہونے کا دن کیا تو قسمت نے دھوکہ دے دیا۔ وہ اس آس پر زندہ رہنے لگا کہ خدا دوسرا دے دیگا۔ مگر اس کے بعد تو اس کی آس پوری ہوئی ہی نہیں۔ جانے اندرونی طور پر صوفیہ میں کیا کمزوری پیدا ہو گئی کہ سال پر سال گزرتے گئے مگر آنگن سونا کا سونا ہی رہا۔

صوفیہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی نہ اچھا پہنتی نہ اچھا کھاتی اس کا شوہر جو کچھ بھی کماتا تھا اتنا تو ضرور تھا کہ دو میاں بیوی مزے سے کھا پی سکیں۔ مگر گھر پر ایسی غربت اور نحوست چھائی رہتی کہ بس! اور جب وہ اپنے کام سے لوٹتا تو دیکھتا کہ صوفیہ مشین پر جھکی ہوئی ہے۔ رات ہو جاتی تو وہ ایک مدھم چراغ جلا لیتی۔ مستقل سلائی کرنے سے اس کی بینائی کمزور ہونے لگی۔ اور نیچے دیکھتے دیکھتے نزلے نے اپنی جڑیں گہری کر لیں۔ پہلے تو اِکے دُکے بال سفید ہونے لگے پھر تو پورا سر چمکنے لگا۔ مگر اپنے آپ سے بے خبر صوفیہ پیسہ جمع کرنے کی دھن میں لگی رہی۔

سولہ سال یوں ہی بیت گئے۔

ان سولہ سالوں میں ایک بھی دن ایسا نہ گزرا تھا کہ صوفیہ نے دن میں کئی کئی بار اپنی رقم کو نہ گنا ہو۔ اور جب کبھی وہ رقم گنتی اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا۔ وہ سوچتی اب صرف چند دنوں کی محنت اور مصیبت باقی ہے۔ پھر تو میں کار میں بیٹھ سکوں گی۔ اسے ہنسی آجاتی

"واقعی کرنل صاحب کی بدصورت باورچن میم صاحب اس لائق نہیں تھی کہ وہ کار میں گھومتی — اب لوگ دیکھیں گے کہ کار میں کیسی صورتیں سجتی ہیں۔ اسے اپنے حسن پر کبھی ناز نہ رہا تھا۔ مگر اب کار کے بارے میں سوچ آتا تو اپنے حسن کا بے پناہ احساس اسے مارے ڈالتا سیتے سیتے وہ صرف یہ سوچتی رہتی کہ وہ پہلے پہل کس طرح کار میں بیٹھے گی۔ کون سی ساڑی پہنے گی۔ کیسا سنگھار کرے گی۔ اس کا دل خوشی اور فخر کے مارے اپنی جگہ چھوڑنے لگتا۔ اس دن صوفیہ نے کمرے میں جاکر پوری رقم گنی، کئی لوٹ، کئی روپے چلّر، کاغذ کے نوٹ، تانبے کے سکّے — یہ وہ ڈھیر تھا — جو اس کی ساری تمنّاؤں کا حاصل تھا —————— اس نے آخری نوٹ اٹھایا۔ دس ہزار سے بھی چند روپے اوپر ہی ہو گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ کئی جگہوں سے سلائی کا بقایا آج یکمشت مل گیا تھا اور رقم پوری ہو گئی تھی۔

روپے گن گن کر اس نے پھر گنے — پھر اور — نوٹوں کو چلّروں کو کاغذوں کو، سکّوں کو، کئی بار اس نے اٹھایا، چوما۔ دیکھا، اٹھایا چوما۔ وہ خوشی سے ناچتی ناچتی بالکل بچوں کے سے انداز میں آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی — وہ خود کو سنا دینا چاہتی تھی کہ وہ بھی اب کار میں گھومے گی

آئینے سے بڑھ کر کون سچا ہوا ہے۔ صوفیہ نے دیکھا، آئینے کے سامنے ایک بڑھیا کھڑی تھی۔ سفید کالے کھچڑی بال۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے چہرے پر جھرّیاں۔ ملگجا پیلا رنگ، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں۔

صوفیہ کہاں چلی گئی!

اس بڑھیا کے حلق سے چیخ نکلی۔ "صوفیہ کہاں چلی گئی!" پھر

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ۔ "کار میں بیٹھ کر سیر کرنے کو گئی ہے نا۔؟"
قہقہے اونچے ۔ اونچے اور اونچے ہوتے گئے ۔ آخر وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی ۔

اس کا شوہر جب گھر آیا اور صوفیہ کو یوں بے ہوش پایا تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لایا ۔ کئی گھنٹے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے اس کے شوہر کو سنایا ۔
"کسی گہرے صدمے نے آپ کی مسز کو پاگل کر دیا ہے ۔"

باراتی

"امّی میں لال جوڑا پہن لوں؟"

"امّی میں وہ کامدانی والی نیلی ساڑی پہن لوں؟"

"خالہ جان میرا ست لڑا آپ کے صندوقچے میں تو نہیں؟"

"ہائے ممّی، وہ میرا گوٹا کناری والا ہرا دوپٹہ کدھر گیا؟"

امی خوشدلی سے سب کے مطالبات پورے کر رہی تھیں۔ سب کو مشورے بھی دیئے جا رہی تھیں ۔ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی ۔

"اللہ ممی، ہم گھوڑوں والی بگھی میں ایرپورٹ جائیں ۔؟" رعنا نے اپنی لمبی چوٹی گوندھتے ہوئے سوال کیا۔

امی ہنس پڑیں ۔ "اری لڑکی باولی ہوئی ہے کیا کوئی برات جارہی ہے کہ بگھی پر جائیں گی بیچاری۔ ڈرائیور سے کہو موٹر نکال لے ۔"

ان سارے ہنگاموں سے بے پروا شادی، جو کچن میں ناشتہ تیار کرا رہی تھی اب ذرا "چوکنی" ہوئی اور رعنا سے مخاطب ہو کر بولی

"کچھ تو یہ "چکر" کیا ہے؟"

"ارے اللہ! تم تو نہ صرف گھوڑے بلکہ ہاتھی، اونٹ اور گدھے تک بیچ کر سوتی ہو۔ پتہ نہیں رات کو اقبال ماموں کی ٹرنک کال آئی تھی کہ آج شام سرفراز بھیا امریکہ سے لوٹ رہے ہیں۔"

"اقبال ماموں کی ٹرنک کال؟ خود سرفراز فون نہیں کر سکتے تھے کہ میں اس دن اور اس تاریخ کو انڈیا پہنچ رہا ہوں۔"

رعنا جل کر بولی۔ "تم تو سدا نیند اور خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہو گی۔ اری پاگل یہی سب تو انھوں نے اقبال ماموں سے کہا۔ پہلے تو انھوں نے خود ہمیں فون کرنا چاہا لیکن لائن بہت گڑبڑ تھی اس لئے انہوں نے ماموں کو فون کر کے کہہ دیا کہ آپ یہ پیغام "ممی" تک پہنچا دیجئے۔" پھر اس نے جھلا کر کہا۔ "مگر تم وکیلوں کی طرح بس جرح کرتی رہو گی یا تیار بھی ہو گی۔؟"

"میں؟" شادی گھبرا کر بولی۔ "میرا بھلا ایئرپورٹ پر کیا کام؟"

"اور ہم سب تو گویا وہاں بھیا کے ہلدی چڑھانے جا رہے ہیں نا۔ پاگل کہیں کی! چل اُٹھ۔!"

نہیں نہیں رعنا، تم لوگ جاؤ۔ میں امی کے ساتھ رہوں گی۔ گھر پر بھی تو آخر اتنے سارے کام ہیں۔"

رعنا ابھی امی سے شکایت کرنے ہی والی تھی کہ خود ہی بول اٹھیں

"اے بیٹیا اب وہ نہیں جانا چاہتی تو کیوں مجبور کرتی ہو؟ آخر کو اللہ کے حکم سے سرفراز گھر پر ہی آئے گا۔ یہیں مل لے گی۔ جاؤ بیٹی تم کم سے کم کپڑے تو بدل ڈالو۔"

شادی نے اپنے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی۔ "اچھے تو ہیں امّی۔"

"بُرے تو میں نے بھی نہیں کہے۔ لیکن ذرا دیکھو تو دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں کیسے پھیکے لگ رہے ہیں۔"

شادی نے ایک نظر امی کو دیکھا۔ منہ سے کچھ نہ بولی، سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

رعنا، شوکی، جینی کو مخاطب کر کے امّی بولیں۔ "دیکھو بچیو۔ ایرپورٹ سے بھائی کو لے کر سیدھی گھر آنا۔ اور راستے میں خدا کے لئے آئسکریم نہ خود کھانا اور نہ بھائی کو کھلانا۔ موئی بھوک مر جاتی ہے۔ میں نے گھر پر ہی بہت کچھ تیار کرایا ہے۔ اور تمہاری سب سہیلیاں آگئی ہیں یا نہیں؟ دیر نہ ہو جائے۔"

"ارے ممی۔" جینی حیرت سے بولی۔ ڈرائنگ روم سے کان پھٹ کر دینے والی آوازیں آپ کو نہیں سنائی دے رہی ہیں کیا۔؟ پوری فوج اکٹھی ہو گئی ہے۔"

دو کاروں پر لد کر پورا قافلہ خدا خدا کر کے روانہ ہوا۔ ان کے جاتے ہی شادی اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جانے لگی۔ امّی نے اس کی طرف دیکھا۔ نیلے رنگ کی سوتی ساڑھی، اسی رنگ کا بلاؤز، سنگار مطلق کچھ نہیں۔ زیور کے نام پر کانوں میں ہلکی سی بالیاں تک نہیں۔ ہاتھ

چوڑیوں سے بے نیاز ۔ نہ انگوٹھی نہ مالا ۔ نہ کاجل نہ پوڈر ۔ لگتا ہی نہیں کہ یہ اسی زمانے کی گریجویٹ لڑکی ہے۔

"شہزادی ۔" امّی نے اسے پیار سے پکارا۔

وہ پلٹی تو امّی بولیں ۔"ادھر آؤ بیٹی ۔"

اس کے حسن کا مرکز اس کی خوبصورت گلابی سی ناک تھی ۔ جس میں ایک خوبصورت چھوٹی سی ہیرے کی لونگ دمکتی رہتی تھی ۔ وہ ناک اور لونگ جیسے خاندان بھر کی ساری لڑکیوں کا مول تھی اس کا خاموش چہرہ ، مگر بولتی آنکھیں ، ساری دنیا کی گویائی جن کے نثار ۔ وہ یوں ہی کھڑی رہی ۔

تم نے دیکھا نہیں شہزادی ، ساری لڑکیاں یوں بن ٹھن کر ایک سے ایک بھاری کپڑا پہن کر گئی ہیں مانو کسی شادی میں گئی ہوں ۔ ان سب سے کیا یہ تمہارے کپڑے میل کھائیں گے ۔؟"

میں بھی تو ان سے میل نہیں کھاتی نا امّی ۔"

"پاگل ۔ یوں نہیں کہتے ۔" انھوں نے اسے کھینچ کر گلے لگا لیا "تیرا نام ہی شہزادی نہیں تو تو واقعی شہزادی ہے ۔ میری بیٹی ۔ جس محفل میں تو سج جائے ۔ وہاں کی ہر سجاوٹ پھیکی پڑ جائے ۔"

اس کی آنکھیں بھر آئیں ۔ "یہ سب آپ ہی تو ہیں امّی جس کی وجہ سے میں زندہ ہوں ورنہ ...

ایسی باتیں نہیں کیا کرتے بیٹی ۔"

سمجھاتے سمجھاتے امی کی اپنی آواز بھی رندھ گئی ۔" جاؤ منہ

پر سے ہٹا کر چوم چوم لوں اور کہوں "میری جان، ان ہاتھوں کو میں نہیں پہچانوں گا تو اور کون پہچانے گا۔ ؟۔ یہ تمہارے ہاتھ ہیں جنھیں میری دنیا سنوارنا ہے۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو میرے سونے آنگن میں کیاریاں لگا کر موتیا کے پھول اگائیں گے۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو میرے بچوں کا پالنا ہلائیں گے اور یہی وہ ہاتھ ہیں جو بولتے نہیں ہیں لیکن جن کی اپنی ایک زبان ہے اور وہ زبان یہ دہراتی گاتی رہتی ہے۔" میں تمہاری ہوں۔ میں تمہاری ہوں"

وہ کسی سنگ مرمر کی مورتی کی طرح کھڑی بے معنی اور خالی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ ہو۔

وہ دھیرے دھیرے جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "میں فرشتہ نہیں ہوں اسی دنیا کا ایک انسان ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ازدواجی زندگی کی کوئی خوشی تمہیں نہ ملے، جس سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ کبھی اس کا پیار تمہیں نصیب نہ ہو۔ کیونکہ مجھ ایسے محبت بھرے دل کو توڑ کر تم اپنی دنیا آباد کرو گی۔"

"نہیں! وہ چلائی۔" اللہ ایسا بے انصاف نہیں ہے کہ دعا بھی آپ ہی کی سُنے اور بد دعا بھی آپ ہی کی سنے۔ کیا جذبۂ پرستش میرے پاس نہیں ہے۔ عبادت میں بھی کرتی ہوں۔ دعائیں میں بھی مانگ سکتی ہوں اور مانگتی ہوں۔ لیکن آپ کی طرح دعا کی آڑ میں بد دعائیں نہیں دیا کرتی۔ اور بد دعا بھی اسے جسے پیار کیا جائے۔ میں نے کبھی آپ کے لئے کوئی بد دعا نہیں مانگی۔ حالانکہ وہ اللہ گواہ ہے جو ہر جذبے سے باخبر ہے کہ کوئی رات ایسی نہیں گزری جس نے میری آنکھوں کو بند دیکھا ہو۔

۔۔۔۔ چاند سے جب بھی میری ملاقات ہوئی کھلی آنکھوں سے ہی ہوئی ۔ ستاروں سے میری اتنی گہری شناسائی ہو چکی ہے ۔ کہ سورج مارے حسد کے ان کا وجود مٹا مٹا دیتا ہے ۔ لیکن یہ سب میں کس کو سنا رہی ہوں ۔ جس نے میرا دل تو توڑا ہی توڑا ، اپنی پیاری امی کو بھی نہیں چھوڑا ۔ " ایک دم اس نے اپنے گلے میں کچھ ٹٹولا ۔ اور ایک لاکٹ نکال کر اس کی ڈبیہ کھولی اور ایک کاغذ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی "یہی ہے وہ نوشتۂ تقدیر جس نے میرے سہرے میں صرف آنسو ہی چڑھائے ہیں ۔"

ایک مڑا تڑا کاغذ ۔ سرفراز نے اسے جھپٹ کر کھولا ۔

"امی آپ نے لڑکی کا جو حلیہ کھینچا ہے اور جو سراپا بیان کیا ہے (اور جس کی اتنی تعریفیں بھی ساتھ ہی کر دی ہیں) اسے پڑھ کر تو میں بہت ہی ہنسا ۔ سچ کہتا ہوں امی کہ ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا تو دور رہا ۔ میں اس کی شادی میں براتی بن کر شامل ہونا بھی پسند نہ کروں گا ۔ امی پلیز ، نئی نسل کے اختیارات اب نئی نسل کو ہی سونپ دیجئے"

"لیکن ..... لیکن ..." وہ اٹک اٹک کر بولا ۔ "اس خط سے تمہارا کیا تعلق ہے ؟"

"وہی گاؤں کی گنوار لڑکی جس کا حلیہ پڑھ کر آپ پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا تھا ۔"

سرفراز حیرت سے سُنتے گیا ۔

"آپ کو پتہ ہے انجینئر صاحب ۔ ہندستان کی اپنی الگ ریتیں رسمیں ۔ اور روایتیں ہیں ۔ آپ امریکہ میں رہے ۔ بسے فارنیر ۔ بھلا

آپ کو اسں دقیانوسی ملک کی باتیں کیا معلوم ؟ لیکن اس ملک میں ماں باپ جب اپنی پسند کے کسی لڑکے لڑکی کا رشتہ طے کر دیتے ہیں تو وہ اتنا سوچا سمجھا اور اتنا مکمل ہوتا ہے کہ اس میں کہیں جھول نہیں ہوتا ۔ نئی نسل لاکھ یہ سمجھتی رہے کہ ماں باپ نے ہمارے حق میں اچھا نہیں کیا لیکن میرا عقیدہ تو یہ ہے پیرانے ہاتھ شائد ہی کوئی غلط کام کرتے ہوں ۔ میری طرح کی بے وقوف لڑکیاں ایسے رشتوں کو خدائی حکم سمجھ کر تعویذ بنا کر گلے لگا لیتی ہیں ـــ آپ کو پتہ ہے میری اَمّی ابا دونوں کے انتقال کے بعد امی مجھے اپنے پاس لے آئی تھیں ۔ گاؤں میں میں نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی ، یہاں امی نے مجھے کالج بھجوا کر بی، اے کرایا ۔ اور ایک دن آپ کی تصویر دکھا کر مجھ سے پوچھا "بیٹی میرا ایک ہی لڑکا ہے ۔ تو مجھے بیٹیوں سے بھی زیادہ پیاری ہے ۔ پھر مرتی ہوئی دور کی غریب رشتہ دار بہن سے کیا ہوا وعدہ میرے دل پر نقش ہے کہ میں اسے کبھی خود سے جدا نہ کروں گی ، تو میں چاہتی ہوں کہ تیری مرضی سے سرفراز کو خط لکھ دوں ، تاکہ وہ امریکہ سے کوئی میم نہ لٹکا لائے ۔"

وہ دن میری زندگی کا ایسا پیارا دن تھا کہ الفاظ ان جذبات کے اظہار کے لئے غلاموں کی طرح عاجز اور بے دست و پا نظر آتے ہیں ۔ میں کیا بتاؤں میں کتنی خوش تھی ـــ اب تک میرے پاس کچھ بھی نہ تھا ۔ اور ایک ہی بات کہہ کر امی نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا ۔ خدا نے خوشیوں کے دبے چھپے سارے خزانے جیسے مجھے سونپ دیئے تھے ۔ لیکن یہ ساری خوشیاں اتنے کم دن کی تھیں جتنے دن میں امی کے خط کا جواب آیا ۔ اور پھر زندگی کو گھن لگ گیا ـــ اس کے بعد آپ آئے ۔ میں نے

مرجانا چاہا۔ لیکن سوچا مر جاؤں گی تو آپ کو کیسے دیکھ پاؤں گی۔ ہر خوشی سے محرومی ملی۔ کم سے کم آپ کے دیدار کی پیاس تو بجھ گئی۔ میں نے امی سے کہہ دیا کہ آپ سے میرا تعارف نہ کرائیں۔ اور جو کہانی آپ کو سنائی گئی وہ بھی گڑھی ہوئی تھی۔ لیکن آپ کو آج سُنا دوں کہ جب آپ سو جاتے تھے تو۔ میں گھنٹوں دروازے میں کھڑی آپ کو دیکھا کرتی تھی۔ سوچتی تھی یہ خوبصورت آنکھیں جو اس وقت بند ہیں اللہ جانے کس خوش نصیب کو خواب میں دیکھ رہی ہوں گی، میں جاگتے میں کبھی آپ کے سامنے ہو کر گزری تک نہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں خود کو آپ پر ظاہر کرنا چاہتی ہوں۔ نمایاں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو پتہ نہیں عورت کی محبت ایک ایسا خاموش دیا ہے جو ایک ہی مندر میں جلتا ہے۔ اور وہ مندر ہے اس کا دل۔ میرے دل میں آپ تھے، آپ ہیں، آپ رہیں گے، شمع کی صورت، امید بن کر، اجالوں کی مانند، کیونکہ بہر حال آپ میری پہلی اور آخری محبت ہیں لیکن .... لیکن ... " وہ سسکی، "میں اب آپ سے شادی، نہیں کروں گی۔ کسی سے بھی نہیں کروں گی ... "

"ارے نہیں بیٹی ۔" راہ داری سے اچانک امی کمرے میں داخل ہو گئیں۔ " میرے بچے پر ایسا ظلم نہ کرنا۔ اس بے چارے نے تو یہ لکھا تھا نہ میں براتی بن کر شامل ہونا پسند نہیں کروں گا۔ اسے دولہا بن کر شامل ہونے سے کیوں محروم کر رہی ہے۔؟"

" امی آپ .... ؟" شہزادی مارے گھبراہٹ کے اور کچھ نہ کہہ سکی، ۔

"ہاں بیٹی، میں تمہیں ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک آئی تو تم دونوں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میں نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ اب بہت ہو چکا۔ میرے کانوں نے کتنی ہی مدت سے شہنا ئیوں کی آوازیں نہیں سنی ہیں۔ ایک دم وہ مسکرا کر پلٹیں۔

"ارے بھئی، تم لوگ نئے زمانے کے لوگ — شہنائی بجوانا پسند کروگے یا بینڈ باجہ؟"

سرفراز دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر ہنستے ہوئے بولا" امّی آج سے نئی نسل اپنے سارے اختیارات پرانی نسل کو سونپتی ہے۔"

امّی کے چہرے پر مامتا کی گلابیاں بکھر بکھر گئیں۔ انھوں نے آگے بڑھ کر ایک ساتھ دونوں کو گلے لگا لیا۔

سُورج

"بارات آرہی ہے — اری جلدی جلدی تیار ہو جاؤ۔"

بارات آرہی ہے، سنتے ہی یہاں سے لے کر وہاں تک سارے میں کھلبلی مچ گئی، دالان مہمانوں سے اٹاپٹ بھرا ہوا تھا۔ گھر والیاں ہی کیا کم تھیں کہ رہی سہی خالی کھدری جگہیں، ان بے حساب بچوّں والیوں نے بھر کر رکھ دی تھیں — وہ ہلّو اور جھوڑ ہو رہی تھی کہ گھر پر مچھّی بازار کا گمان ہو رہا تھا۔ شادی کی خوشی میں جن لڑکیوں بالیوں نے صبح ہی سے اپنے عقد خوانی والے کپڑے پہن ڈالے تھے۔ اب السائی ہوئی صورتیں لئے اپنی اپنی اماؤں کے پلو کھینچتی پھر رہی تھیں کہ چوتھی والا جوڑا اب پہننے دیں۔ بعد کا بعد میں دیکھا جائے گا۔

۔ اماؤں کو شوہروں اور ننھے بچوں کے کام کاج سے ہی فرصت کہاں تھی جو دہ بچشم بجشی میں پڑتیں، چابیوں کے جھیلے پھینک کر وہ نچنت ہوگئیں اب بھلے سے لڑکیاں جو بھی کریں ـــ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لڑکیاں سنگار پٹار سے آراستہ ہو کر چھپا چھپ کپڑے پہن پہن کر دلہن والے کمرے میں جمع ہو رہی تھیں ۔ گوٹے، نکھی، الماس، ستارے جڑے ہوئے دوپٹے، کامدانی کڑھے ہوئے کرتے، چمکیاں جھل جھلیاں، ٹنکی جگمگاتی ساڑیاں ۔ یہاں سے وہاں تک اُجالے بکھیر رہی تھیں ۔ بڑی بڑی عمر کی معتبر خواتین جہیز کے جوڑوں کے ٹانکے لگا رہی تھیں ۔ زیورات کے ڈبوں کی نئے سرے سے دیکھ ریکھ کر رہی تھیں ۔ ذرا کم حیثیت کی بیبیاں پان سپاری کی دکان سامنے کھولے بیڑے بناتی بیٹھی تھیں ـــ ممانی پھوپھی ٹائپ کی بیگمات، باورچیوں کے سروں پر سوار تھیں ۔ باہر سے لاؤڈ اسپیکر پر مسلسل شہنائی کا ایک غمگین سُر ابھرے جا رہا تھا ۔ ایسے میں پرچھتی پر سے خالہ بی کی دہائی نے کہ "بارات" آرہی ہے ـــ ، نئے سرے سے زندگی کو ہنگامہ خیز بنا دیا ۔ سب تو اپنی تیاریوں میں مشغول تھے ۔ مگر ہائے کوئی صابرہ کے دل سے بھی پوچھتا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے ـــ نکاح کا سرخ سرخ انگارے برساتا جوڑا صبح ہی سے سسرال سے آچکا تھا جو اس کے پاس ہی چھپر کھٹ پر دھرا تھا ۔ وہ لرزتے کانپتے دل سے آنکھیں چرا چرا کر اس جوڑے کو دیکھتی اور اس کا رواں رواں تھرا اُٹھتا ـــ

" اللہ ۔ یہ خوبصورت جوڑا ایک ساتھ کتنی نئی ذمہ داریاں میرے سر لانے والا ہے ۔ "

اس کی چہیتی سہیلی اور خالہ زاد بہن شمی اس کے ہاتھوں پیروں کی مہندی چھڑا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ موقع اور عمر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر چھیڑ چھاڑ بھی کرتی جاتی تھی۔

"اب مہندی رچے ہاتھوں سے پہلے تو دولہا بھائی کو آپ سلام کریں گی ۔ پھر آگے کا پتہ نہیں ۔" اور وہ کھن کھناتی ہنسی ہنسنے لگی۔ اک دم وہ چونکی ۔ اس کی ہاتھ کے پشت پر یہ گرم گرم دو قطرے ۔ ؟

"ارے صبّو تو رو رہی ہے ۔ ؟

صابرہ نے بغیر دھلے ہاتھ ہی اس کی گردن میں ڈال دیئے اور لپٹ کر سسکی ۔" شمو میرا جی ہر طرح گھبرا رہا ہے ۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے"

وداعی کے لمحات قریب آرہے ہوں تو سبھی سہیلیاں ایسے ظاہری طور پر بھلے ہی چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں ۔ مگر دل اندر سے روتے رہتے ہیں ۔ اپنی پیاری کی جدائی پر بھی اور ان دیکھے وسوسوں پر بھی جو پتہ نہیں آئندہ زندگی کو کس کس رنگ میں رنگیں۔ شمی جیسے اندر سے چیخ پڑی ۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی ۔

"اری پاگل تجھے ہوا کیا ہے ۔ ؟ جانتی نہیں نعیم بھیّا تجھے کتنی چاہت اور ارمان سے بیاہ کر لے جا رہے ہیں ۔ کوئی غیروں کا معاملہ تو ہے نہیں بڑی پھوپھی ہی کے تو لڑکے ہیں اور تجھے کیا چاہیئے ۔ ؟ آنسو پونچھ کر وہ ذرا سا مسکرائی ۔ " اور کوئی ایسی ویسی چاہت ہے ان کی ۔ پورے چھ سالوں سے تیری چوکھٹ پر سر گڑ رہے تھے ۔"

اور یہ سچ بھی تھا ۔ صابرہ کو ایک دو بھی نہیں ۔ دسیوں ہی پیغامات

تھے، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجنیئر، کوئی بزنس مین، کوئی زمیندار۔ لڑکی پڑھی لکھی ہو اور خوبصورت بھی ہو تو پیغام جھڑ بیری کے بیروں کی طرح گرتے ہیں۔ انہی بے شمار پیغامات میں ایک پیغام نعیم کا بھی تھا، جو اس کی اپنی بڑی پھوپھی کا بیٹا تھا۔ اور محض پانچ سو روپے کی چھوٹی سی تنخواہ پر ملازم تھا۔ ان پیغامات کی موجودگی میں جب نعیم کا پیغام آیا تو اماں خاموش رہ گئیں کہ لڑکی کے یہاں بھی طرح کے پیغامات آتے ہیں لیکن رضا بھیا خاموش نہ رہ سکے اماں کو خاموش دیکھ کر بولے۔

"کیوں اماں کیا آپ سمجھتی ہیں کہ جس لڑکی کے گھر کے نوکروں کو مجموعی طور پر پانچ سو سے کچھ زیادہ ہی تنخواہ جاتی ہو، وہ ایک ایسے شوہر کے ساتھ خوش رہ سکے گی، جس کی تنخواہ پانچ سو کے لگ بھگ ہو۔"

اماں پھر بھی کچھ نہ بولیں۔

"ڈرائیور۔ مالی، دربان اور باورچی کو ملا کر پانچ سو تنخواہ دی جاتی ہے نا اماں ۔۔ ؟"

اماں اب کے سے بولیں تو یہ بولیں ۔ "اللہ رکھو جس کا بھائی اتنا دھنی ہو وہ اپنی بہن کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔" رضا بھیا گڑبڑائے۔

"تو کیا آپ نے نعیم کے حق میں فیصلہ کر لیا ۔؟"

"اے نہیں بیٹا۔ میں تو بات سی بات کر رہی تھی ۔" لیکن یہ تو حقیقت ہی ہے کہ جوڑے اللہ کے یہاں سے ہی بن کر آتے ہیں ۔ اب نعیم میاں کی پسلی کا جوڑ ہی اگر صابرہ تھی تو اماں کیا کرتیں اور رضا بھیا بھی کیا بگاڑ لیتے۔ اور ویسے شاید یہ پیام رہتا بھی نا اگر ایک بار نعیم

صابرہ سے محض ایک بات نہ کہہ دیتا۔

" چھابی تمہیں پتہ ہے آسمان پر صرف ایک ہی سورج ہوتا ہے لیکن وہی ایک سورج دنیا کے ذرّے ذرّے کو روشنی بخشتا ہے۔ عورت کی دنیا بھی صرف ایک ہی سورج کی محتاج ہوتی ہے چھابی ۔ تم جو اتنی پیاری، اتنی حساس اور اتنی دل میں اُتر جانے والی لڑکی ہو چھابی ۔ تمہارے لئے جی چاہتا ہے ایسا شوہر ملے، جو تم چلو تو تمہارے قدموں میں اپنا دل بچھا دے۔ جو تمہاری مسکراہٹ کو وہ قدردانی بخشے کہ سمجھے اسی تبسم سے کلیاں پھول بنتی ہیں۔ جو یہ سمجھے کہ تمہارے آنسو (خدا نہ کرے جو کبھی تمہاری آنکھیں ان موتیوں سے آشنا ہوں جنھیں دنیا والے آنسوؤں کا نام دیتے ہیں۔) وہی پہلا پہلا انمول پانی ہے، جو کسی سیپ میں جا گرے تو اس کا مقدّر بدل جائے۔ تم نے چھابی زندگی میں دولت تو اتنی دیکھی ہے، کہ اتنی مٹی بھی تم نے اپنے قدموں تلے شائد ہی روندی ہو۔ خدا کرے اب تمہیں وہ انسان، وہ سچا چاہنے والا ملے جو تم سے پیار کرے۔ چھابی تم سے ۔ تمہاری دولت سے نہیں"

چھابی نے گھبرا کر اسے دیکھا تو وہ اپنی ہی رو میں کہے گیا تھا۔

تم نے سائے دیکھے ہیں چھابی ۔ دھوپ اور چھاؤں کے سائے، کبھی یہاں، کبھی وہاں، ! دولت بھی اسی کی طرح ہے۔ وہ تو کسی کو بھی کبھی بھی چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ چھابی لیکن ادھر دیکھو، تمہیں قسم ہے چھابی ادھر دیکھو ایک محبت بھرا دل رکھنے والا شوہر کبھی نہیں بدل سکتا۔ میں سمجھتا ہوں میں تمہیں جتنا خوش رکھ سکوں گا۔ اتنا کوئی نہیں رکھ پائے گا۔ پتہ ہے کیوں ؟ میں تمہیں چاہتا ہوں چھابی صرف تمہیں۔ تمہاری دولت کو نہیں ۔"

سچ تو ہے پھر بھابی کو ڈرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ؟ بھیّا آخر پھر اپنے ہی بھیا تھے۔ جب اماں کا جھکاؤ انھوں نے نعیم کی طرف دیکھا تو سمجھ گئیں کہ اپنی کسی سکھی سہیلی سے صابرہ نے ہی اماں سے کہلوا دیا ہوگا کہ وہ نعیم کے لئے ہاں کر دیں۔ ورنہ اتنے ماڈرن زمانے میں کسی بی، اے پاس لڑکی کا، جس کے بارے میں بھی کہتے ہوں کہ ہزاروں میں ایک ہے، ہاتھ کسی کے ہاتھ میں محض ماں کی مرضی سے نہیں دیا جا سکتا۔۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ نعیم کی باتیں جیسے اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گئیں تھیں اور وہ زندگی کے اس دن کی سخت مشکور تھی جب سارے لوگ کسی دعوت میں گئے تھے۔ ———————— ۔ اور وہ سر درد کے مارے اکیلی گھر پر تھی۔ اور یوں نعیم کو اکیلے میں صابرہ سے دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا تھا۔ ورنہ اب اماں ایسی آزاد خیال بھی نہ تھیں کہ جس لڑکے کا بیٹی کو پیام تھا اس کے ساتھ من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دے دیتیں۔

"آپی ۔ بڑے ابا نے کہلوایا ہے جلدی سے دلہن کو سجا سنوار دیں۔ قاضی صاحب آ گئے ہیں۔" نسرین غرارے کے پائینچے سنبھالتی آئی اور شمی سے اتنا سندیسہ دے کر اُلٹے پیروں بھاگ گئی

لڑکیوں کا ایک پرا بھاگتا ہوا آیا اور دلہن کے کمرے میں ڈٹ گیا

"اللہ شمو باجی ۔ دولہا بھائی کا جوتا چھپائیں"

"پان میں نمک ڈال کر کھلائیں ۔"

الائچی میں کنکر بھر کر رکھ دیں ۔"

"اری آزاد گھوڑیو ۔ نکلو یہاں سے مجھے دولہن کو سنوارنا ہے۔

اور تم ہو کہ اپنے بے ہودہ پروگراموں میں ہی مجھے کھپا رہی ہو۔" اور اس نے سب کو باہر ڈھکیل کر باہر کر کے دروازہ بند کر دیا۔

سرخ گھونگھٹ اٹھا کر شمی نے صابرہ کے چاند ایسے چہرے کو ٹھوڑی پکڑ کر اونچا کیا اور شرارت سے بولی۔

"اللہ کیا روپ اترا ہے۔!! مگر یاد رکھ جیسے سجا بنا کر آج بھجوا رہی کل صبح ایسے ہی واپس آنا۔" چھابی شرم سے دہری ہو گئی دروازے سے پردہ بھڑ بھڑاہٹ تھی کہ شمو کو دروازہ کھولتے ہی بن پڑی۔

"اوہو ہو۔ یہ ٹھاٹ ہیں۔"

اب جو دھائیں دھائیں مچی ہے۔ تو رکنے کا نام نہیں۔ بڑی ممانی نے آکر ڈانٹا۔

"اری بے شرمو تمہارے ماموں وکیل لے کر آرہے ہیں، ذرا تو ادب سے بیٹھو۔"

اور وہ سارا دن قیامت بن کر ان لڑکیوں پر سے گزرا۔ بیباک جملے، ہنستے ہونٹ، تیز تیز جملے سب آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ صابرہ پرائی ہو گئی۔

آرسی مصحف کے بعد جب رضا بھیا نے جو کہ ابّا میاں کی موت کے بعد وہی صابرہ کے باپ تھے، دولھا کے ہاتھ میں دلہن کا ہاتھ دیا تو میراثنوں نے وہ گیت چھیڑ دیا جس نے دلوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ بھائی کی زبان سے وداع ہونے والی بہن کے لئے محبتوں کا خزانہ!

ہولا ڈو میری ڈولا چڑھی...

میں نے تمہیں کس ناز اور پیار سے پالا۔ پھولوں کو بھی کوئی ایسے سنبھال کر نہیں رکھتا۔ میری بہن میں تو تیرے لئے چاند کا ٹیکہ اور تاروں کی مالا پرو دیتا اگر تو اشارہ بھی کر دیتی میری دلاری۔

میں تو سارے باغوں کی کلیاں لا کر تیری راہوں میں بچھا دوں کہ تیرے نازک تلوے لہولہان نہ ہو جائیں میری بہن، تیری چہکاریں دنیا بھر کے پرندوں سے برتر۔ اب تو چلی میری بگیا ویران ہو گئی بہنا۔

ہو لاڈو میری ڈولا چڑھی۔

"پھر بھی میں اداس نہیں ہوں کہ تو اپنا گھر لبسانے جا رہی ہے۔ خدا تیرا باغ بغیچہ ہرا بھرا رکھے، اس میں ننھے ننھے پھول اور منّی منّی کلیاں کھلیں کہ تجھے کبھی میں یاد نہ آؤں۔

ہو لاڈو میری ڈولا چڑھی۔

اور جواباً وداع ہونے والی بہن کی فریاد

او بھیا! اب نہ آؤں کبھی تیری گلی،

اللہ نے تجھے کیا نہیں دیا۔

کس چیز سے نہیں نوازا

تیری اتنی اونچی حویلی کہ آسمان سے باتیں کرے۔ تیرے خزانوں میں اتنا روپیہ کہ زمین پر پھیلا دے تو زمین چھپ جائے۔

پھر بھی تجھ سے ایک بہن نہ پالی گئی

میں نہ آؤں کبھی تیری گلی۔

بھائی کی درد بھری پکار

پالنے کا سوال ہوتا تو میں تجھے آنکھ کی پتلی بنا کر پلکوں کے سائے میں رکھتا۔

دولت لٹانے کا سوال ہوتا تو تجھ پر ساری دولت لٹا کر کنگال ہو جاتا۔ یہ اونچی حویلی، یہ چوبارے سب تجھ پر صدقہ۔ مگر بہنا نہ پیغمبروں نے اپنی بیٹیاں بٹھائیں، نہ راجے مہاراجوں نے۔ نہ بادشاہوں نے نہ فقیروں نے کہ اے بہن یہ پھول کھلتا ہی اس لئے ہے کہ اسے دوسرے کے آنگن کی زینت اور سجاوٹ بنا دیا جائے ۔ میری بہن روتی ہوئی جا مگر ہنستی ہوئی آنا۔

صابرہ کا دل اس کے حلق میں آن پھنسا تھا۔ اس نے زندگی میں دوسروں کی شادیوں میں ہزاروں بار بابل سنے تھے۔ لیکن آج میراثنوں نے موقع کی مناسبت سے یہ کیسی وداعی گائی؟ بہن کے دل کی کیسی بھرپور ترجمانی کی تھی۔؟ اور ایک مجبور بھائی کے دل کی دردانگیز پکار؟؟

رضا بھیّا زبان سے کچھ نہ کہہ سکے، کہنے کا یارا ہی نہ تھا، بڑے بزرگ قریب کے، دور کے، رشتہ دار سب ملتے گئے ۔ سب سے آخر میں اماں آئیں صابرہ کا جی ہل گیا۔ وہ کیسے اماں سے ملے گی ۔؟؟ آنسوؤں پر کیسے قابو پائے گی، مگر اماں کا بے پناہ ضبط اسے جیتے جی مار گیا۔

"بیٹی ۔ میری جان ۔ میری گڑیا۔"

اور پھر وہ خاموش سی رہ گئیں ۔ ایسی خاموشی جو کسی زبردست طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے کتنے آنسوؤں کا گھونٹ کر انھوں نے اپنے احساسات کو زندگی بخشی !

"بیٹی ہر ماں کو اپنی بیٹی سے بڑی بڑی امیدیں رہتی ہیں۔ مجھے امیّد

ہے بٹیا تم وہی کروگی جس کی میں نے تم سے آرزو کی ہے۔ میں تم سے کہا کہوں چاند — ہر بات بیان کی محتاج تو نہیں ہوتی۔ اتنا ضرور کہوں گی بیٹی کہ پھولوں کو تو سب ہی گلے لگاتے ہیں۔ لیکن کانٹوں سے پیار کوئی نہیں کرتا۔ اللہ کرے جو تمہاری پھولوں بھری زندگی میں کبھی کوئی کانٹا کھٹکے لیکن خوبی تو یہی ہے بٹیا کہ پھولوں کے ساتھ کانٹوں سے بھی نباہ کرلو— شوہر محض گھر کا مالک ہی نہیں ہوتا — وہ تمہارے دُکھ سُکھ کا ساتھی بھی ہوتا ہے۔ اس کے سکھ تمہارے نہ ہوں دکھ ضرور تمہارے ہونے چاہئیں یہی وہ کسوٹی ہے، بٹیا جس پر گھس کر ایک لڑکی ایک مکمل عورت بنتی ہے۔ تمہارے نئے سفر کے لئے میں تمہیں اور کیا سوغات دوں بیٹی سوا اس آرزو کے کہ تمہارے ہونٹوں پر جب بھی ہنسی بکھرے وہ تمہارے شوہر کے لئے ہو اور تمہاری آنکھ میں چمکنے والا ہر موتی بھی اسی کے نام سے منسوب ہو...... آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں اور بے دم سی ہو کر وہیں سسک پڑیں

نئی زندگی نئی مصروفیتیں — نئے لوگ اور نیا پیار! صابرہ جیسے خوشیوں میں کھوگئی — وہ سوچتی واقعی اس نے نعیم سے بیاہ کر کے زندگی میں سب سے بڑی عقلمندی کی ہے۔ شادی کی رات روایتی پیار و محبت کی باتوں سے ہٹ کر نعیم نے اس سے کہا تھا۔

"بھابی تمہیں پتہ ہے تم سچ مچ آسمانوں پر چمکنے والا چاند ہو۔ جس کی آرزو بھی محض حماقت تھی لیکن اب جبکہ تم میری ہو صرف میری، کیا سچ مچ مجھے اور میرے گھر کو اپنا سمجھوگی۔"

صابرہ شرما کر رہ گئی تھی تو وہ بے تابی سے بولا تھا۔ "تم کبھی مجھے

حقیر تو نہیں سمجھو گی ۔"

صابرہ نے یکبارگی حیرت سے سر اٹھا کر پوچھا تھا ۔" حقیر آپ کو ۔ کیوں بھلا ۔ ؟"

اس لیئے کہ تم رضا بھیا کی بہن ہو ۔ ایک امیر گھرانے کی امیر لڑکی میں غریب آدمی ۔ تمہیں کیا دے سکوں گا ۔ ؟"

"بس بس ....." بھابی نے اپنا سرخ سرخ چھوٹا سا مہندی لگا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا ۔" ایسی بے کار کی باتیں نہ سوچیئے ۔ کیا دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے ۔ ؟ میں نے تو آپ سے پیار کیا ہے آپ کی ذات سے، آپ کی شخصیت سے محبت کی ہے ۔ آپ کروڑ پتی ہو جائیں یا اللہ نہ کرے کتنے بھی غریب ۔ میں آپ کی ہوں اور آپ کی ہی رہوں گی ۔"

۔ ۞ ۔

شادی کے چند ہفتوں کے بعد جب دونوں میاں بیوی پہلی بار ایک ساتھ رضا بھیّا کے ہاں گئے تو وہ مارے خوشی، خاطر تواضع کے بچھ بچھ گئے واپسی پر اماں بھیّا اور بھابھی نے انھیں تحفوں سے لاد، لاد دیا ۔ ابھی شادی ہی کے بے حساب کپڑے، اَن پہنے تھے کہ مزید کئی جوڑے دونوں کو تحفہ میں ملے ۔ صابرہ کو سونے کا ایک خوبصورت سا سیٹ بھابی نے دیا اور نعیم کو ایک بھاری گھڑی ۔

"تم ہو واقعی لکی چھابی ـــ" نعیم توصیفی انداز میں بولا ۔

"وہ کیسے ۔ ؟" چھابی نے حیرت سے پوچھا ۔

"یہی کہ رضا بھیا جیسے بھائی کی بہن ہو ۔" وہ مسکرایا۔ صابرہ سنجیدہ ہو گئی ۔" آپ کو پتہ ہے ۔ بڑے لوگ ایک مثل کہا کرتے ہیں "لاکھوں کا بھائی نہ تنکے کا سائیں ۔" مطلب یہ ہے کہ اگر بھائی کتنے ہی پیسے والا ہو، اور سائیں یعنی شوہر کتنا بھی فقیر کہ بس تنکا جس کے پاس ہو، تو بھی سائیں ہی بہتر ہے ۔ میں تو سمجھی تھی آپ مجھے یوں ہی کہہ رہے ہوں گے کہ میں آپ کی بیوی بنی ۔ اتنے قدر دان محبت والے ۔ مر مٹ جانے والے شوہر کی بیوی ۔!"

چھایا کی باتوں سے معصومیت، سچائی اور سادہ لوحی کی جو خوشبو آ رہی تھی ۔ اس نے نعیم کا دل ایک ساتھ خوشبوں اور آنسوؤں سے بھر دیا۔ اس نے بھاری دل سے سوچا۔ خوش نصیب تو در اصل وہ خود ہے۔ جسے ایسی بیوی ملی ۔"

لیکن دونوں کے پیار محبت میں، ہلکی سی دھار، اس وقت پڑی جب صابرہ، پہلے پہل، ماں بننے کو ہوئی ۔ کچھ ہی ماہ پہلے نعیم کا تبادلہ بمبئی ہو چکا تھا۔۔ پہلے سب ایک ساتھ رہتے تھے، مشترکہ گھر تھا۔ مشترکہ آمدنی اس طرح ذمہ داریاں بھی کم تھیں۔ خرچہ بھی کم، اور جب ایک دم سے بمبئی جیسی مہنگی بستی میں تبادلہ ہو گیا تو حالات ہی بدل گئے۔ صابرہ امیرانہ ماحول میں پلی بڑھی لڑکی تھی جس نے کبھی ہل کر پانی بھی نہ پیا تھا۔ سسرال میں بنھ ہی گئی، کیوں کہ پھوپھی جانتی تھیں کہ وہ ایسی بیٹی کو بہو بنا کر لائی ہیں۔ جو چلتی بھی تھی تو پیروں تلے، کنیزوں کی ہتھیلیاں بچھ جاتی تھیں اور انھوں نے کبھی چاہا بھی نہیں کہ صابرہ سے کوئی ہلکا سا کام بھی

لیں۔ ویسے بھی ان کے یہاں کھانا پکانے کے لئے ایک ماما اور اوپر کے کام کے لئے ایک بڑے میاں تو تھے ہی۔ بہو کے میکے کی طرح ڈرائیور، مالی اور دو، دو خانساماں اور دربان نہیں تھے۔ لیکن بہو کو کبھی تکلیف بھی نہ ہوئی۔ ایک تو بمبئی کی آب ہوا صابرہ کو کچھ بھائی نہیں دوسرے متلی، چکر اور قے کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نے نعیم سے بڑی سادگی سے کہا۔

"کل میں نے کھانا پکایا تو اس قدر متلی ہوئی، ایک خانساماں کیوں نہ رکھ لیں۔"

نعیم ایک بار ٹریننگ کے سلسلے میں بمبئی آیا ہوا تھا اور یہاں کی مہنگائی سے واقف تھا۔ بولا۔

"ملتا ہو تو رکھ لو۔ کیا حرج ہے۔"

"ہاں ملتا تو ہے۔ برتن مانجھنے والی بائی کہہ رہی تھی ایک بھروسے کا خانساماں ہے پچاس روپے لے گا۔"

"پچاس روپے۔؟" نعیم دیدے پھاڑ کر بولا۔ "بائی کو ہم آگے ہی پندرہ روپے دے رہے ہیں۔ پچاس خانساماں کو کتنے ہو گئے پینسٹھ فلیٹ اتنا چھوٹا، اور حقیر مگر پھر بھی ڈیڑھ سو روپے کرایہ۔ اب پانچ سو میں باقی رہے کتنے؟

تو بھیا کو لکھ کر ان کے ہاں سے ایک خانساماں بلوا لوں۔ دو دو ہیں اور اتنا کام بھی نہیں ہے۔" نعیم جو اب تک اخبار پڑھ رہا تھا اور بائی دی وے باتیں کر رہا تھا اخبار ایک طرف رکھ کر کچھ نرمی اور کچھ خفگی سے بولا۔ "تمہیں پتہ ہے تم نے ابھی کیا کہہ دیا ہے۔؟"

صابرہ نے تھوڑی دیر حیرت سے سوچا۔ اور بولی "میں نے....؟
میں نے تو بس یہی کہا کہ بھیّا کو کہہ کر خانساماں بلوائے لیتی ہوں۔"

"چھابی ـــ" نعیم نے التجائیہ انداز میں ـ لیکن ایسی التجا جو حکم پر بھاری تھی ـ بولا "تمہیں یاد دلا دوں چھابی تم ایک لکھ پتی بھائی کی بہن ضرور تھیں ـ لیکن اب ایک پانچ سو روپے ماہانہ پانے والے چھوٹے سے آفیسر کی بیوی ہو ـ ماضی کو بھول کر حال کو اپناؤ چھابی یہ ہم دونوں کے لئے بہتر ہے۔"

چھابی سوچتی ہی رہ گئی کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے. لیکن نعیم جو چھابی کا دیوانہ تھا ـ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا ـ اُسے سخت لہجہ میں کوئی بات کہہ ہی نہیں سکتا تھا. آج ذرا الجھ کیوں گیا تھا. وہ اپنی جگہ سہم سی گئی ـ ٹال گئی ـ وہ خود بھی نعیم سے سچ مچ اتنا پیار کرتی تھی کہ اس کی ہلکی سی کڑوی بات کو ٹال بھی سکتی تھی ـ

پھر ایک دن اسی قسم کی واردات ہو گئی ـ ذکر یہ تھا کہ زچگی کے لئے چھابی میکے جائے یا بمبئی ہی میں اپنا کیس کسی اچھی سی لیڈی ڈاکٹر کو دے دے. لازمی چھابی میکے جانے کے فیور میں تھی ـ وہ بڑی سادگی سے بولی ـ
"میں تو اماں کے پاس ہی چلی جاؤں گی، اب امّاں ضعیفی میں اتنی دور آئیں ـ خواہ مخواہ تکلیف ـ"

"مائیں بیٹیوں کے لئے اتنی تکلیف اٹھاتی ہیں ـ ایک ہلکی سی تکلیف یہ بھی سہی ـ ناگپور سے بمبئی ایسا کون سا دور ہے ؟ تم انھیں لکھ کر دیکھو ـ"

وہ ذرا رُکتے رُکتے بولی۔ "میرے خیال سے وہیں اچھا رہے گا۔ بھابی بھی رہیں گی۔ سب سے ملے دن کتنے ہو گئے ہیں۔ اسی ہاسپٹل میں اپنا کیس بھی دے دوں گی جس میں بھابی نے دیا تھا۔"

"بھابی والی ڈاکٹر تو شائد زچگی کی فیس پانچ سو لیتی ہے"۔ نعیم ذرا گھبرا کر بولا۔

"ہاں لیتی تو ہے۔" چھابی لاپروائی سے بولی۔ "مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟"

کوئی فرق ہی نہیں پڑتا؟ ارے بابا یہ تو سوچو کہ میری ایک ماہ کی تنخواہ چلی جائے گی، پوری۔" نعیم تھوڑا سا مسکرایا۔

"ارے، آپ کی تنخواہ کیوں جائے گی، بھیّا دے دیں گے فیس۔"

نعیم ذرا بور ہو کر بولا۔ "ہر بات میں بھیّا بھیّا ٹھیک نہیں لگتا۔ بات کو سمجھا کرو ذرا۔"

چھابی تنک کر بولی۔ "تو کیا ہوا آخر کو میرے بھائی ہیں۔"

"بھائی ضرور تمہارے سہی لیکن اب ان کا پیسہ تمہارا نہیں چھابی — مرد کا اپنا ایک وقار ہوتا ہے۔ تم اگر بات بات پر بھیا کو پکارو گی، تو میری تو رسوائی ہے ہی تمہاری بھی ذلّت ہے۔ کیوں کہ بہر حال شادی مجھ سے تم نے اپنی ہی پسند سے کی ہے۔"

چھابی بچپنے کی سی حماقت اور معصومیت سے بولی۔ "لیکن آپ کو جو تحفے ملتے رہے ہیں تو تو کبھی آپ نے رسوائی محسوس نہیں کی۔"

"وہ بات اور ہے۔ اور یہ قطعاً اور۔ یہ کتنی عجیب بات ہے

کہ ہمیں اگر نوکر کی تکلیف ہو تو رضا بھیا کو پکاریں۔ پیسے کی کمی پڑے تو ان کی طرف دیکھیں۔ ڈاکٹر کا بل دینا ہو تو ان کے آگے ہاتھ پھیلائیں اب تو ہمیں جو کرنا ہے انہی پانچ سو میں کرنا ہے۔
سمجھیں میری جان۔"

اس نے پیار سے لپٹانا چاہا۔ لیکن چھایا بجھ سی گئی تھی۔ اس نے کوئی گرم جوشی نہ دکھائی۔ "شائد نعیم کے پیار اور التفات میں کوئی کمی آرہی ہے۔" اس نے اندیشے کے ساتھ سوچا۔ لیکن نعیم اس کی دوا کا وقت ہو جانے پر روز کی طرح اسے اپنے ہاتھ سے دوا کھلانے اٹھ گیا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ "نہیں وہ مجھے ابھی بھی اتنا ہی چاہتے ہیں۔ شائد میں کچھ غلط سوچنے لگی ہوں۔"

اس دن کی چپقلش کو اماں کے خط نے ختم کر دیا۔ ان کا بے حد پیار بھرا خط خود نعیم کے نام آگیا تھا کہ پہلی زچگی اگر میکے میں ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ ویسے تم اس کے شوہر ہو جو چاہوگے وہی ہوگا، لیکن یہ ایک ماں کے تڑپتے دل کی چھوٹی سی آرزو ہے۔ رضا خود بھی تمہیں خط لکھنے والے ہیں کہ صابرہ کو چند ماہ کے لئے چھوڑ جاؤ۔ ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ آخر میں پھر انھوں نے ایک بار لکھا تھا۔ تم اگر صابرہ کو لے کر آرہے ہو تو تار سے اطلاع کر دینا تاکہ گاڑی اسٹیشن بھجوا سکوں۔" اب اس خط کے بعد تو بحث مباحثے اور انکار کی گنجائش ہی نہ رہ جاتی تھی۔

صابرہ جب ماں بنی تو نعیم بمبئی میں ہی تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔ اب یہ سن کر کہ وہ باپ بن گیا ہے اس سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا

ننھے سے بیٹے کو دیکھنے کے لئے بُری طرح اس کا جی مچل رہا تھا۔ لیکن سوچا کہ اس بار جاؤں تو الگ پیسہ خرچ ہوگا اور جب بیوی بچے کو لینے جاؤں گا تو دگنا روپیہ آنے جانے اور انھیں لانے میں لگے گا وہ من مار کر رہ گیا وہ اپنی خواہشات کو مار سکتا تھا لیکن کسی کے آگے قرض کے لئے ہاتھ پھیلا کر ہیٹا نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

چالیس دنوں پر چھلّا ہوا تو اسے بھی دعوت آئی۔ نہ بھی آتی تو جانا ضرور تھا، اب تو بیوی کے ساتھ ساتھ اسے بچے کی بھی سخت یاد ستانے لگی تھی حالانکہ اب تک دیکھا نہیں تھا۔ لیکن تصور میں وہ کئی بار اپنے بچے سے مل چکا تھا۔ اسے گودی میں اٹھا کر پیار کر چکا تھا۔ واپسی پر ساس نے حسبِ دستور اُسے دو سو روپے سلامی دی۔ وہ مسکرایا۔ "یہ سلامی کا چکر بھی خوب ہے۔ چلو کم سے کم ندامت کا احساس تو نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ تو دولہوں کا پیدائشی حق ہے کہ وہ سسرال سے ہر عید، بقر عید اور بچے کی پیدائش پر روپیہ بٹورتے رہیں۔"

لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ لوگ یہ بھی سوچیں کہ وہ صرف لینا ہی جانتا ہے دینا نہیں۔ دوسرے دن وہ بھابی کے لئے ایک قیمتی ساڑی اور رضا بھیّا کے لئے ایک سوٹ کا کپڑا لے آیا۔ اپنے بچے کے ساتھ ساتھ ان کی بچی کے لئے بہت سارے کھلونے بھی۔ صابرہ بھی بے حد خوش ہو گئی۔ بھئی آخر اس کے میاں سے ہی اس کی اپنی عزّت اور بڑاپن تھا تحفوں کے علاوہ خود صابرہ کو بھی بھیّا نے دو سو روپے دیئے تھے۔ ننھے بچے کے ہاتھ میں بھی سو روپے رکھے۔ لیکن آتے آتے وہ اپنی ماں اور گھر والوں

سے ملتا آیا۔ بہو نے امی کو دادی بنایا تھا۔ وہ خوش خوش منتظر تھیں کیسے نہ جاتے۔ واپسی پر حسب معمول پھر خالی تھا۔ گھر واپس پہنچے تو صابرہ نے بچے کے لئے پالنا لینا چاہا۔ جاکر دیکھا اور پسند کیا تو پالنا تین سو روپے کا تھا کتنی حقیر رقم تھی۔ لیکن وہ لے نہیں سکتی تھی۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ نعیم اس کا دل بہلانے کے انداز میں بولا۔

"دوسرا پسند کرلو۔ وہ بہت بڑا ہے۔"

"بڑا نہیں ہے۔" چھابی پہلی بار جل کر بولی۔"اس کا دام بڑا ہے جو آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"چھابی" دکان دار کے سامنے وہ اور کیا کہتا بس چھابی کہہ کر رہ گیا وہ سینڈل پھٹ پھٹاتی دکان سے باہر نکلی تو نعیم اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔"بات تو سنو۔"

"میں نہیں سنتی آپ کی باتیں۔"

"دل برا مت کرو۔ پالنا پسند آہی گیا ہے تو لے لو، میں کسی دوست سے قرض لے لوں گا۔"

"میں قرض لینے کو کب کہہ رہی ہوں۔"

"تو اس طرح تماشا تو نہ بناؤ۔"

"نہیں میں اپنا کوئی زیور توڑ لوں گی۔"

"چھابی" نعیم غصے سے چلایا۔" ایسی باتیں کہہ کر میری ذلت نہ کرو۔ اور کبھی اماں اور بھیا کو پتہ چل گیا کہ زیور توڑ توڑ کر تم اپنا گذارا کر رہی ہو تو میں زندہ رہ پاؤں گا۔؟"

وہ چلائی۔ "تو پھر آپ کے حالات ٹھیک نہیں تھے تو آپ نے شادی ہی کیوں کی۔؟ اچھی بھلی میں بھیا کے پاس رہتی اور ٹھاٹ کرتی"

نعیم کا پارہ بھی چڑھ گیا۔ تو روکتا کون ہے۔ ابھی بھی چلی جاؤ نا اپنے بھیا کے پاس ... پھر اس نے ماحول کی اہمیت کو محسوس کیا۔ وہ دونوں دکان کے باہر کھڑے تھے، بھابی کی گود میں بچہ بھی تھا۔ ایسے میں کس قدر شرمناک بات تھی کہ وہ لڑے جا رہے تھے۔ بھابی نے اچانک بے تحاشہ رونا شروع کر دیا تھا۔

"گھر چلو۔" نعیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا

اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"میں نہیں آتی ،، ایسے شوہر کے ساتھ جو میرے اخراجات نہ اٹھا سکے۔" بیٹھنے کو تو وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی لیکن منہ پھیر کر۔ گھر جا کر بچے کو تو اس نے پنگوڑے میں پٹخا اور خود پلنگ پر اوندھ گئی۔ آنسوؤں اور خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ بند ہوتا ہی نہ تھا۔ شادی کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ کیسے ہنگامے اور دھوم دھڑکے تھے۔ یہاں سے لے کر دہاں تک جہیز سجا ہوا تھا۔ مہمان بھرے ہوئے تھے۔ کھانے پک رہے تھے۔ دھڑا دھڑ دیگیں اتر رہی تھیں۔ پیسے کی کوئی فکر ہی نہیں۔ اس کے بھیا کس قدر پیسے والے ہیں۔ کیا مزے سے کنوارپن کی زندگی گزاری۔ یہاں تو ابھی دو سال بھی چین سے نہیں گزرے ہیں۔ ویسے اس نے خود کو بدلنے کی کس قدر کوشش کی۔ اماں کے یہاں تو ہاتھ، ہاتھ کو پاؤں پاؤں کو نوکر لگے ہوئے تھے۔ یہاں جھاڑو بہارو سے لے کر، کھانا پکانا، سینا پرونا سبھی اپنے نصیب میں

آن پڑا ہے ۔ دراصل میں خود ہی پاگل گدھی ہوں کہ ایک آئیڈیل بیوی بننے کے چکر میں دوڑ، دوڑ کر میاں کا کام کر رہی ہوں ۔ کھانا پروس رہی ہوں ۔ کام والی بائی نہ آئے تو دھنادھن برتن مانجھ رہی ہوں ۔ میلے کپڑے گندے موزے (آخ تھو) دھو رہی ہوں ۔ حد ہے کوئی غلطی میری ہی تھی ۔ نعیم نے دیکھا کہ چلو مفت کی باندی مل گئی ہے ۔ تو اسے خوب دباؤ ۔ اگر میں شروع گھڑی سے اپنی اکڑ میں رہتی تو جناب کی مجال نہ ہوتی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتے ۔ بس ہاتھ جوڑے غلاموں کی طرح کھڑے رہتے اور اب ؟ اور اب تو دن رات کی چخ چخ ہے ۔ تو کیا وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں ان سے نباہ کر لوں گی ۔ ؟ اور شادی سے پہلے، باتیں تو اس قدر بڑی بڑی بنائی تھیں کہ میں بھی جھانسے میں آ گئی ایسا لگتا تھا کہ بیچارے مجھے زمین پر چلنے ہی نہ دیں گے ۔ بس آنکھیں بچھا دیں گے ۔ اور اب تو جھڑک کر بات کرنا معمول ہو گیا ہے ۔

امّاں نے وداع کے سمے جو باتیں کہی تھیں ان کو سن کر تو ایسے لگتے تھے جیسے بیچارے موم کے ہیں ۔ اب ذرا اماں آ کر اپنے لاڈلے داماد کو دیکھیں ۔ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا ۔ اور جذبۂ خود ترسی اس وقت بے طرح اُمڈا ہوا تھا کہ چھایا دھائیں دھائیں روئے جا رہی تھی ۔ ایسے میں نعیم نے آ کر دھیرے سے کیا پکارا کہ گویا بارود میں آگ لگا دی

"بس میں کہے دیتی ہوں کہ مجھ سے بات نہ کیجئے ورنہ ہاں ۔

"چھایا تم غصّے میں کبھی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتیں ۔"

"ہاں ہاں پاگل جو ہوں ۔ اور واقعی ہوں جو آپ جیسے کنگلے

سے شادی کر ڈالی ۔ مجھے تو بیسیوں ہی پیغام ایک سے ایک بڑھ کر تھے ۔ آپ جیسا دھوکے باز کوئی ہو گا ، خواہ مخواہ مجھے شیشے میں اتارا ۔

نعیم بڑی نرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا ۔ " ٹھیک ہے چھابی لیکن اتنا بتاؤ ، کوئی اور شوہر ہوتا تو تمہاری اتنی کڑوی باتیں پی لیتا ۔ ؟؟ ۔۔۔ تمہارے ایسے بول سن سن کر گھر سے باہر نہ کر دیتا ۔ "

" ارے تو آپ بھی تین لفظ بول کر کر دیجئے نا گھر سے باہر ۔ ہمت تو ہے نہیں ۔ "

" نہیں چھابی ۔ " نعیم اسی نرمی سے کہے گیا ۔ ہمت کا سوال نہیں ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اگر میں وہ تین مکروہ لفظ بھی کہہ دوں تو تمہارے مسائل حل نہ ہوں گے ۔ مجھ سے ٹھکرائی جاؤ گی تو پورے زمانہ کی ٹھکرائی مانی جاؤ گی میرے ساتھ رہنے سے بھلے سے ہی غربت سے ، ہی سہی ' ۔ جو تمہارا وقار ہے مٹ جائے گا ۔ "

چھابی بپھر کر اٹھ بیٹھی ۔ " آہا ۔ بہت وقار ہے کیا کہنے ہیں ۔ کیا میرے بھائی بھابی مر گئے ہیں ۔ ؟ کیا میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی ۔ ؟

" رہ کیوں نہیں سکتیں چھابی ۔ " وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا ۔ ۔ " لیکن زمانے والے انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں گے ۔ یہی رضا صاحب کی وہ بہن ہے جسے اس کے شوہر نے چھوڑ دیا ۔ اور تمہیں پتہ ہے چھابی ۔۔ پھر بھابی بھی تمہیں وہ پیار اور عزت نہ دے سکیں گی جو وہ اب دیتی ہیں ۔ اور رضا بھیا پال ضرور لیں گے لیکن بوجھ جان کر ۔ ۔ ۔ تم خود ہی وہ مثل بھول گئیں شاید لاکھوں کا بھائی نہ تنکے کا سائیں ۔ ۔ ۔ "

"بس بس ختم کیجیے اپنی تقریر۔" بھابی چلائی "مجھے بوجھ سمجھیں گے آپ۔ رضا بھیا نہیں۔"

"میں ۔ ؟ ہاں میں تمہیں بوجھ ضرور سمجھتا ہوں لیکن پھولوں کا سا لطیف اور ہلکا پھلکا بوجھ ۔ جسے ہاتھوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لینے کو جی چاہے" اب وہ خالص مردوں والی خوشامد پر اتر آیا تھا لیکن بھابی تو انگارے اگل رہی تھی ۔ چیخ کر بولی "سینے سے لگائیے اپنی ہونے والی سوتیوں کو ۔ میں اب آپ جیسے شخص کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی ۔ میں ابھی جا کر بھیا کو تار کرتی ہوں کہ مجھے آکر لے جائیں"۔ اور سچ مچ ہی وہ نعیم کے دیکھتے دیکھتے اٹھی اور تیر کی طرح باہر نکل گئی۔

"اچھا ہوا کہ ابھی ایک ہی بچہ ہوا ہے ۔ زیادہ ذمہ داریاں گلے نہیں پڑیں ۔ اور میں بھی ابھی جوان ہوں ۔ طاقت ہے کہیں بھی کام کر سکتی ہوں ۔ پڑھی لکھی ہوں نوکری بھی کر سکتی ہوں ۔ یہ آدمی اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی چلی گئی۔

دو دن بڑے سخت ٹینشن میں گزرے اور تیسرے دن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ پانچ بجے سچ مچ ہی پریشان حال رضا بھیا حواس باختہ چلے آرہے ہیں۔ بھابی اس قدر سنجیدگی سے لڑائی بڑھا دے گی وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ "خیر اب رضا بھیا آہی گئے ہیں تو کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔" وہ اپنی جگہ یوں ہی بیٹھا رہ گیا۔ رضا بھیا نے خود پریشانی سے پوچھا۔

"کیا ہوا نعیم - خیریت تو ہے میں سخت پریشان ہو کر چلا آیا - چھابی نے تار دیا تھا کہ "کسی بھی حالت میں فوراً آجایئے -" وجہ نہیں لکھی - خیریت تو ہے کہاں ہے وہ - ؟" ایک سانس میں وہ کئی باتیں پوچھ رہے تھے
"جی خیریت ہے" وہ جبراً مسکرایا - "چھابی اندر بچے کے پاس ہے"
ڈیڑھ دن سے وہ چھابی کے کمرے میں نہیں گیا تھا - ایک بار منانے کی کوشش کی تھی ضرور مگر اس نے ایسے بُرے الفاظ سے نوازا تھا کہ وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا - اس نے اپنے ضبط کا بے پناہ مظاہرہ کیا تھا کہ اسے بس طلاق نہیں دی تھی - ورنہ چھابی بس اس موڈ میں تھی کہ اسے اتنا اشتعال دلائے کہ وہ تین بار پکار پکار کر کہہ دے کہ ہاں طلاق، طلاق - طلاق -
رضا بھیّا لپکے ہوئے اندر گئے - اور اتنے عرصے میں نعیم کان بنا بیٹھا رہا - بس چھابی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں - اور بار بار رضا بھیّا کا اصرار، کہ آخر کیا ہوا - بڑی دیر کے بعد چھابی کے آنسو تھمے -
"بھئی مجھے بلایا کیوں ہے ؟ دیکھو تو بھاگم بھاگ پلین سے آیا ہوں"
"مجھے آپ کی بہت یاد آرہی تھی بھیّا" اس کی آنسوؤں بھری آواز میں اب قدرے مسکراہٹ چھلک رہی تھی۔

"ارے پاگل - یاد آرہی تھی تو ایسا تار دینے کی کیا ضرورت تھی" کہ کسی بھی حالت میں فوراً آجائیے -" خط لکھ دیتی میں نہ آجاتا -"
"بالکل نہ آتے وہ ناز سے اٹھلائی - بس لکھ دیتے کہ بزنس میں مصروف ہوں، یہاں جانا ہے، وہاں جانا ہے۔ اور ٹال جاتے - اب تو آنا ہی پڑا نا - ؟" وہ کھل کھلا کر ہنسی - ایک دم سے دھیمی سی سرگوشی میں

بھیّا نے پوچھا۔ " نعیم سے تو جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا نا۔؟"

"ارے نہیں بھیا" وہ خوش دلی سے ہنسی۔ وہ تو فرشتہ ہیں فرشتہ۔ وہ کیا جھگڑیں گے بھلا۔"

"روپے پیسے کی تو کوئی کمی نہیں نا۔ نہ ہو تو مجھ سے لے لے"

"ارے کمال کر رہے ہیں بھیّا آپ۔ ہماری کون سی بڑی فیملی ہے جو پیسے کی کمی پڑے۔ پانچ سو بہت ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان کا پروشن جو ہونے والا ہے۔ ویسے میں بے حد مزوں میں ہوں بھیّا۔"

نہیں نہیں میں کب کہتا ہوں کہ پانچ سو کم پڑتے ہوں گے۔ لیکن کبھی کبھار خرچے بے ڈھنگے ہو جاتے ہیں نا۔ وہ کبھی تاش، کبھی پکچر۔ کبھی وہ

"نہیں بھیا۔ وہ ہنسی۔ ان بے چاروں کو تو ایسا کوئی شوق ہی نہیں۔ سارا پیسہ میرے ہی ہاتھ میں لاکر دیدیتے ہیں۔ اور پھر کبھی اُلٹ کر پوچھتے بھی نہیں کہ کیا کیا۔ سچ بھیّا میں بڑی قسمت والی تھی کہ ایسا فرشتہ شوہر ملا۔" پھر اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھُل گئی۔

باہر بیٹھا بیٹھا نعیم پگھل گیا۔ اب اس سے صبر ہونا مشکل تھا۔ وہ تیزی سے بے تابی سے اٹھا اور اندر کی طرف چلا تو۔ اک دم راستے میں اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ اور ہاتھ میں اٹھا لیا وہ منّے کی کھلونا گاڑی تھی۔ غصّے میں چھابی نے سارا سامان پھینکا تھا تو منے کے کھلونے بھی اٹھا کر پھینک دیئے تھے۔

رضا بھیّا نے اسے ٹھوکر کھاتا دیکھا تو اپنے رشتے سے فائدہ اٹھا کر فقرہ کسا۔ "گاڑی ٹوٹی تو نہیں؟ دونوں پہیئے برابر ہیں نا؟"

"نہیں بھیّا" اس نے جھینپی ہوئی چھابی پر ایک مسکراتی نظر ڈال کر کہا ۔ "ذرا ٹھوکر لگی تو تھی مگر "کوئی" بر وقت سنبھل گیا... !"

رضا بھیّا کچھ نہ سمجھے مگر چھابی کی مسکراتی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔

"اگر لڑوں گی نہیں تو تم سے پیار بھی کیسے کر پاؤں گی میرے سورج — !"

عیدی

میرے گلے میں ایک بے حد خوبصورت لاکٹ جھولتا رہتا ہے۔ دل کی وضع کا سونے کا یہ لاکٹ کتنوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ چکا ہے ــ سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں ۔ "یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں چھپا رکھی ہے جو کبھی گلے سے الگ ہی نہیں کرتی ۔"

میں مسکرا کر رہ جاتی ہوں ۔ ایک غم ناک سی مسکراہٹ ۔ کیا لاکٹوں میں صرف پریتم کی تصویریں چھپائی جاتی ہیں ۔ ؟ یہ کوئی ایسا راز تو نہیں ہے جسے میں زمانے بھر کی نگاہوں سے چھپاتی پھروں ــــ لیکن میں اکثر سوچ کر رہ گئی ہوں کہ اگر میں نے یہ بتا دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے کیا سجا رکھا ہے تو کیا سننے والے واقعی یقین کر لیں گے ۔ ؟

آج عید کا دن ہے۔۔ پتہ نہیں اس دن میں کیا خاص بات ہوتی ہے کہ بھولے بسرے پرانے چہرے بھی یوں رہ رہ کر یاد آتے ہیں کہ دل کلپ کلپ جاتا ہے۔ میری یادوں کے افق پر ایک چہرہ عید کے دن خاص طور سے جگمگاتا ہے۔ یوں جیسے وہ چہرہ نہ ہو، چاند ہو۔ جس کی جگمگاہٹ سے دل کا کونا کونا روشن ہو جاتا ہے۔۔ یہ میری دادی بی کا چہرہ ہے۔ محبت کی شعاعوں سے دمکتا ہوا۔ پیار میں ڈوبا ہوا۔

برسوں پہلے کی بات ہے، ان دنوں کی جب شائیں چھ سات برس کی ننھی سی معصوم اور نادان بچی تھی۔ اس سال عید ہمارے لئے محرّم بن کر آئی تھی۔ اس لئے کہ عید سے چند روز پہلے ہماری امی چل بسی تھیں عید کے دن جو چہل پہل اور خوشی ہوتی ہے اس کا دور دور پتہ نہ تھا، بس ایسا لگتا تھا کہ ابھی ابھی کوئی میّت اٹھائی گئی ہے۔ نانی اماں کا اس دن روتے روتے بُرا حال تھا۔ ہمیں نہ عید کے اہتمام میں نئے کپڑے پہنائے گئے۔ نہ گھر میں اچھے پکوان پکے۔ جب محلّے ٹولے کے سارے بچے رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر ادھر ادھر اچھل پھاند مچا رہے تھے۔۔ اس وقت اس جان لیوا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ آج ہمارے گھر عید نہیں آئی ہے۔ جب ہم نے ناسمجھی سے ضد کرنی شروع کی کہ ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے۔ ہم بھی میٹھا کھائیں گے تو نانی اماں نے نوکر کو بلا کر ہدایت کی کہ ان بچّوں کو راحت بوا کے یہاں چھوڑ آ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

نوکر نے ہماری انگلیاں پکڑیں، اور ہمیں ایک صاف ستھرے لپے پُتے چھوٹے سے گھر میں چھوڑ آیا۔۔ وہیں ہم نے پہلی بار محبت سے بھرپور

ایک چہرہ دیکھا۔ وہ نانی اماں کی سہیلی راحت بوا تھیں اور ہماری دادی بی۔ انھوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور گلے سے لگاتے ہی ان کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں۔ "آج اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی۔" آنسوؤں نے ان کا گلا دبوچ لیا اور وہ پھپک کر رونے لگیں۔ ہم حیرت سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ ہماری امی کے لئے یوں دھاروں دھار رونے والی یہ مہربان ہستی کون ہے؟ پھر انھوں نے سنبھل کر ہماری سہمی ہوئی صورتوں کو دیکھا اور بڑے پیار سے غسل خانے میں لے گئیں۔ منہ ہاتھ دھلوا کر انھوں نے بے حد پیار سے میرے سر میں تیل ڈالا۔ اور چوٹیاں گوندھنے بیٹھ گئیں جب بھیا کی اور میری روتی صورتیں بہت سنور گئیں۔ تو انھوں نے بیحد پیار سے دسترخوان بچھایا۔ اور کئی طرح کے کھانے لا کر چن دیئے۔ وہ منہ میں نوالے دے دے کر سر پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر ہمیں کھانا کھلاتی رہیں اور جب نیند سے ہماری آنکھیں مندنے لگیں تو انھوں نے کھلے برآمدے میں ہوا کے رخ پر ایک صاف ستھرا بستر بچھا دیا۔ اور ہم دونوں بہن بھائیوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

کوئی تین چار بجے کے قریب ہم اٹھے انھوں نے پھر سے منہ ہاتھ، دھلوا کر ہمیں محبت سے سنوارا، اور دھوپ ڈھلے جب ہم گھر چلنے کو ہوئے تو انھوں نے دروازے تک لا کر چھوڑا۔ اور جانے سے پہلے اپنی کمر میں اڑسی ہوئی ایک بوسیدہ سی تھیلی نکالی اور بے حد پیار سے ہماری مٹھیاں کھلوا کر ایک ایک چونی رکھی اور بولیں۔ "یہ تمہاری عیدی ہے بچو۔" میں نے بے حد غیر یقینی انداز سے پہلے اپنی مٹھی میں رکھی ہوئی چونی

کی طرف دیکھا اور پھر دادی بی کی طرف۔ پہلی بار شائد میرے ہونٹ کھلے
"۔ یہ ۔ یہ ۔ یہ میری ہے ۔"
"ہاں بیٹی بالکل تیری ہے۔ ۔" پھر وہ بے حد پیار سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولیں ۔" اچھا یہ تو بتا اپنی نانی اماں سے تو نہیں کہہ دیگی کہ میں نے تجھے چونی دی ہے۔"
"بالکل نہیں ۔" میں نے مٹھی کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے کہا
دادی بی جانتی تھیں کہ نانی اماں ان معاملوں میں حد درجہ سخت واقع ہوئی ہیں۔ وہ اس بات کی مطلق روادار نہ تھیں کہ ہم کسی سے ایک پائی بھی لیں بھلے سے وہ عیدی کے ناطے ہی کیوں نہ ہو ۔ جب دادی بی مطمئن ہو گئیں تو انھوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا" اچھا بی بی یہ تو بتا تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی۔"
یہ سوال مجھے گڑبڑا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ نانی اماں نوکر کے ہاتھ میں دو آنے دیکر ڈھیروں سودا لانے کو کہا کرتی تھیں اور وہ زمانہ اس قدر سستے کا زمانہ تھا کہ تھیلا بھر سودا لانے کے باوجود بھی نوکر دو تین بچے ہوئے پیسے نانی اماں کے ہاتھ میں تھما دیا کرتا تھا۔ چار آنے میں تو ایک دنیا آسکتی تھی۔ اگر گڑیا کا بیاہ ہی رچانے بیٹھ جاؤں تو ڈھیروں چاول، شکر، گھی میوے، پھر گوشت سبزیاں کیا کیا نہ خرید سکوں گی۔ پوری بارات کھانا کھا کر اُٹھ جائے گی تب بھی چیزیں باقی بچ جائیں گی۔ میری سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس خزانے کو کس طرح خرچ کر پاؤں گی۔ بس جی چاہ رہا تھا، جلد سے جلد دادی بی کے چنگل سے نکل بھاگوں اور جس طرح بن پڑے اس دولت

ٹھکانے لگا دوں — اس خیال کے آتے ہی پہلے تو میں نے کچھ شک و شبہ سے دادی بی کے چہرے کو دیکھا اور پھر تیزی سے مٹھی بند کر کے چوکھٹ سے ایکدم باہر بھاگی۔ مجھے اپنے پیچھے دادی بی کی محبت اور ہنسی سے بھری آواز سنائی دی — "ڈرتی ہے کہ کوئی اس کی رقم ہتھیا نہ لے۔"

اور حقیقت بھی یہی تھی۔

گھر آنے پر میں اور نئے نئے وسوسوں میں الجھ گئی۔ آخر میں کس طرح یہ رقم خرچ کر سکتی تھی۔؟

یوں نہیں — میں نے سوچا۔ گھر سے ملی ہوئی جو دکان ہے وہیں چل کر سوچتے ہیں۔ اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر خود ہی سوجھ جائے گا کہ کیا کیا لیا جائے۔ کیا نہ لیا جائے

دوسرے دن جب نانی اماں اپنے کاموں میں مصروف تھیں، میں آنکھ بچا کر گھر سے نکلی اور سیدھی کونے والی دکان پر جا پہنچی — ایک انگلی دانتوں تلے دبائے بڑی دیر تک محویت کے عالم میں دکان کا جائزہ لیتی رہی کئی گاہکوں سے نمٹنے کے بعد آخر دکان دار مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں کیا چاہیئے بی بی — ؟"

میں ہڑبڑا سی گئی — "وہ کونے میں جو گڑیا ہے وہ چاہیئے۔"

دکان دار نے گڑیا نکال کر سامنے رکھ دی اور پھر پوچھا "اور کیا چاہیئے؟"

"اور گڑیا کے گلے کے لئے مالا — موتیوں والی —"

"چلیئے یہ قصہ بھی تمام ہوا —" دکان دار خوش دلی سے مسکرایا "اب بتایئے —"

"کاجو۔"

اور — ؟

"وہ کھٹی میٹھی گولیاں۔"

"اور — ؟"

"میں نے جھجک کر کہا رنگین پنسل۔"

"اور — ؟"

میں نے کچھ غیر یقینی نگاہوں سے سامان کے ڈھیر کو تاکا — اتنا کچھ خرید لیا اور یہ دکاندار ابھی تک اور، اور کہے جا رہا ہے۔ میں نے مطمئن ہو کر کہہ دیا — "بس — اب بس۔"

دکان دار نے سامان کا بنڈل بنا کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور ساتھ ہی بچے ہوئے چھ پیسے بھی میرے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ دادی بی کیوں پوچھ رہی تھیں کہ بتا بی بی تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی — تو کیا دادی بی نے واقعی اس قدر رقم حوالے کر دی تھی — ؟ ایک دم سے دادی بی مجھے قصے کہانیوں والی مہربان پری لگیں جو خوش ہو کر جو جی میں آتا بخش دیا کرتی۔

میں خوشی سے لدی پھندی گھر لوٹی — سامنے ہی نانی اماں کھڑی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ میرے پاؤں ٹھٹک گئے اب تو خوب پٹائی ہو گی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سارا قصہ سننے کے بعد نانی اماں کی آنکھیں خود آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں — "بڑی نیک بخت بی بی ہے — خدا دونوں جہان میں اس کی نیکیوں کا صلہ دے گزشت

پوست سے نہیں محبت سے بنی ہوئی عورت ہے راحت بوا۔"

نانی اماں کے ان الفاظ سے میرے دل میں دادی بی کی محبت اور قدر دوگنی تگنی ہوگئی۔

اگلی عید پر بھی ہم دادی بی سے ملنے گئے وہ اسی تپاک سے ملیں جیسے سال بھر ملتی رہتی تھیں۔ اور اس عید پر بھی انھوں نے وداع کرتے ہوئے اپنی بوسیدہ تھیلی میں سے چونی نکال کر دی اور اسی رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"بتا بی بی ان چار آنوں میں تو کیا کیا خریدے گی۔؟"

کتنے سال ایک ایک کر کے یونہی گزر گئے۔ زمانے کے انداز بدلتے رہے۔ مہنگائی بڑھتی رہی۔ پھر جنگیں ہوئیں۔ دنیا کے نقشے بدلے۔ ہندستان پاکستان آزاد ہوئے۔ ایک نئی دنیا کی داغ بیل پڑی اور ہم بھی اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر پردیس میں آبسے۔ ابتک زندگی میں کوئی لمحہ خوشی کا میسّر نہ آیا تھا وہی غربت وہی تنگی وہی حالات۔۔ سوچا تھا کہ نئی جگہ شائد نیا آب و دانہ بدلے گا۔ لیکن قسمتیں بھی کبھی بدلا کرتی ہیں؟ پردیس آکر مصیبتوں کی داستان اور بھی دردناک اور طویل ہوگئی۔ عید آتی تو اور بھی یاد آتا کہ کس طرح دادی بی چار آنے دیا کرتی تھیں جو ایک مدّت کی خوشی کا سامان ہو جاتے تھے۔ پردیس آکر اس دولت سے بھی محرومی ہوگئی۔ پھر کچھ سال اور گذرے — اور زمانہ اس تیز رفتاری سے بدلا۔ اور مہنگائی یوں بڑھی کہ چار آنے تو کیا چار روپے بھی حقیر رقم معلوم ہونے لگی۔ بچپن میں سال بھر عید کا انتظار واقعی عید کی طرح رہتا تھا۔ اب عید آتی تو سادے دن کی طرح یوں ہی گزر جاتی۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ کسی عید کو دادی

بی کی یاد نے ساتھ نہ چھوڑا۔

وقت نے ایک اور بھرپور انگڑائی لی اور میری شادی ہوگئی۔
گویا زندگی بھر کی تمام کلفتوں، مصیبتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ یقین پختہ تر ہوگیا
کہ خدا مصیبت کے بعد راحت اور خزاں کے بعد بہار ضرور دیتا ہے۔ میرے
شوہر بڑے بزنس مین تھے۔ روپے پیسے کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ جنت کا ہمارے
ذہنوں میں یہی تصور ہے نا کہ جس چیز کی تمنا کرو آموجود ہوتی ہے۔ تو
مجھے جیتے جی گویا جنت مل گئی تھی۔ پھر جب خدا نے اس چمن میں ایک نوشگفتہ
کلی اور پھر ایک پھول بھی کھلا دیا تو زندگی سچ مچ ہی بہاروں اور جنت کا
حقیقی روپ ہوگئی۔

دنیا وہی تھی۔ یقیناً دنیا کی مشکلات بھی وہی ہوں گی۔ لیکن میرا
یہ حال تھا کہ کبھی ایک گاڑی ایک سال استعمال کرلی اور اس سے جی بھر
گیا تو یوں نئی خرید لی جیسے بیس ہزار کی نہ ہو بیس روپے کی بات ہو۔ شہر
اور میدان میں رہتے رہتے جی اوب گیا تو پہاڑوں پر گرمیاں گزارنے
چلی گئی۔ تقریباً ہر ہل اسٹیشن پر ذاتی گھر انھوں نے خرید رکھے تھے اور
ویسے بھی رہنے کے لئے بمبئی جیسے شہر میں اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ چلتے چلے
جاؤ مگر کوٹھی ختم نہ ہو۔ اب عید آئی تو ان ہنگاموں کے ساتھ کہ خریداری
شروع ہوتی تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی اور گھر یوں بھر جاتا کہ لگتا کہ دکانیں
کی دکانیں گھر میں لا ڈالی ہیں۔

اس طرح چند سال اور گزرے اور پھر اچانک ایک موقع ایسا آیا
کہ مجھے برسوں بعد وطن عزیز میں عید منانے کا موقع ملا۔ جب ہم

اپنے آبائی مکان میں اترے تو ایسا لگتا تھا کہ یہ گھر نہیں روحوں کا ویران مسکن ہے۔ محلے ٹولے کے پرانے لوگ جانے کدھر جا بسے تھے۔ لے دے کے گھر میں پرانے وقتوں کا بوڑھا مالی رہ گیا تھا جو سرِشام ہی ننھا سا میلا دیا جلا کر ابھاری والے طاقچے میں رکھ دیتا۔ پرانے دن، پرانی باتیں۔ گزری ہوئی گھڑیاں یاد آکر دل کو جیسے مسوسنے لگیں۔ شہر بڑے ہوٹلوں اور بڑے بڑے ریسٹورانوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ کیا ضرور تھا کہ ہم اسی مزار جیسی ویران حویلی میں عید مناتے۔ لیکن میں نے سوچا پرانی یادوں کو تازہ کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔

جب وہ عید کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میں سراپا، بہار بنی کھڑی تھی

"اوہ — یہ ٹھاٹ ہیں!" انھوں نے پیار سے چھیڑا۔ قیامت نظر آرہی ہو۔ کہاں کی تیاری ہے؟"

میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی — یہ ساڑھی گیارہ سو میں انھوں نے خاص طور سے مجھے عید پر پہننے کے لئے دلائی تھی۔ یوں چمکتی جگمگاتی مانو آگ لگی ہے۔ کانوں میں ہیروں کے دمکتے ہوئے لانبے لانبے جھمکے ہاتھوں میں ساڑی سے میل کھاتی زمرد کی اصلی چوڑیاں، گلے میں جڑاؤ ہار۔ ناک میں تارے کی طرح جگ مگ ننھی سی لونگ۔ انگلیوں میں انھوں نے بھرپور انگشتریاں اور پیروں میں نازک نازک چپلیاں جو سونے کے تاروں سے بنی ہوئی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہنس کر بولی "تیاری؟"

"ہاں تیاری ہے تو سہی اور ایک بہت اہم ہستی سے ملنے کی ہے۔"

میں بچّوں کی سی معصوم خوشی سے بولی ۔ "آپ سن بھی لیں تو اس کی اہمیت کو نہ سمجھ پائیں گے ۔۔" پھر قدرے رک کر بولی ۔" وہ میری دادی بی ہیں ۔"

تمہاری دادی بی ۔۔ ؟ وہ حیرت سے بولے "مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری دادی بی کے انتقال کو تو ایک مدت ہو چکی ہے ۔"

"ہاں لیکن یہ دادی بی سدا میری رگ جاں سے بھی قریب رہی ہیں ۔ آپ ملیں تو سہی پھر کہیئے گا کہ ایسی محبّت والی ہستیاں صرف کتابوں میں ملتی ہوں گی ۔۔ ۔ اس دنیا میں تو مثال ناممکن ہے.

انھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

ہماری لمبی کار زن کر کے ایک بوسیدہ سے مکان کے پاس سے گزری اور میں نے چلّا کر کہا" بس بس ۔ روک دیجیے" ۔ یہی میری دادی بی کا گھر ہے ۔" کار ایک نرم جھٹکے کے ساتھ رُکی اور کار کے رکتے ہی بہت سارے بچے بھی وہاں آکر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے گردنیں اونچی کر کے دیکھنے لگے.

میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی ایسا لگا جیسے کسی محل سے نکل کر ماچس کی ڈبیا میں بند ہو گئی ہوں ۔ ایک پرانی سی بُو نے میرا استقبال کیا اور ہلکے ہلکے اندھیرے سے جب میری آنکھیں مانوس ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک مڑی تڑی گٹھری سی پڑی ہے .

"کون ہے ۔ ؟" پاؤں کی چاپ سن کر ایک کمزور سی آواز نے سر اٹھایا ۔

"ارے یہ دادی بی ہیں ۔" میں نے دکھے دل سے سوچا۔ بڑی ہمت جمع کر کے میں نے آواز نکالی ۔ "دادی بی میں ہوں ۔ آپ کی بی بی۔" یوں جیسے ذہن پر زور ڈال کر انھوں نے سوچنا شروع کیا ہو ۔ پھر انھوں نے خوشی سے لرزتی آواز میں اپنے ہاتھ پھیلا دیئے ۔ "اری بی بی تو ۔ ؟ آمنہ بوا کی نواسی ہے نا تو ۔ ؟ گویا انھوں نے یقین کر لینا چاہا ہو ۔

"ہاں دادی بی میں ہی ہوں" ۔ آپ مجھے بھول گیئں ۔!؟

" شرمندگی کے ہلکے سے غبار میں لپٹی اور دکھ میں ڈوبی آواز میں وہ بولیں ۔" نہیں بی بی تو کوئی بھولنے جیسی چیز ہے ۔ مگر برس بھی کتنے گزر گئے کم بخت آنکھیں بھی تو جاتی رہیں ۔"

میرے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا ۔ میں سہم کر بولی ۔ "دادی بی آپ کو نظر نہیں آتا ۔ ؟"

" نہیں بی بی ۔ بس اب تو آنکھوں کے آگے مستقل رات کا سا منظر ہے ۔ اندھیرا ہی اندھیرا ۔ وہ ذرا ہنس کر بولیں ۔" اور بی بی اب دنیا میں دیکھنے کے لئے رہ بھی کیا گیا ہے ۔ اپنے بیگانے ایک ایک کر کے مر کھپ گئے ۔ یا پاکستان چلے گئے ۔ مگر اتنے دنوں میں آج دل چاہ رہا ہے کہ آنکھیں ہوتیں تو اپنی بی بی کو ایک نظر دیکھ لیتی ۔ تیری شادی دادی ہو گئی یا نہیں بی بی ۔ " وہ محبت سے پوچھ رہی تھیں ۔

میں دکھ اور شرم سے بوجھل آواز سے بولی ۔"جی ہاں دادی بی ہو گئی ۔"

"بچے وچے ہیں ۔ ؟"

"ایک لڑکا ایک لڑکی ہے۔"

"ساتھ نہیں لائی ۔"

"نہیں دادی بی بمبئی میں گھر پر ہی ہیں ۔"

"چلو اچھا ہوا ۔" وہ سکھ کی سانس لے کر بولیں ۔ بن ماں کی بچی تھی ٹھکانے سے بیٹھ گئی ۔" ایک دم جیسے انھیں کچھ یاد آیا ۔ وہ مجھے ہاتھوں سے ڈھونڈتی ہوئی بولیں ۔" پر میرے لئے تو تو ابھی بھی بچہ ہی ہے ۔ اب تو کچھ سوجھتا بھی نہیں ورنہ تیری کنگھی تو بھی کر دیتی ۔ آج عید کا دن ہے نا ۔ ہر عید کو تیرے بال سنوارا کرتی تھی یاد ہے نا ۔"

میں نے گردن سے اونچائی پر بندھے اپنے بڑے سے جوڑے کو محسوس کیا، جس میں چمپاکرن کا سونے اور موتیوں کا کلس جگ مگ کر رہا تھا اور سہم کر بولی" دادی بی اب تو میں بہت بڑی ہو چکی ہوں ۔"

"ہاں بی بی پر میرے لئے تو تو آج بھی وہی ننھی سی بچی ہے جو میرے ہاتھوں کے بنے نوالے کھا کر میرے بستر میں ہی سو جایا کرتی تھی ۔" ایک دم انھوں نے بے لبسی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کسی کو پکارنا شروع کیا ۔" اری زینو ۔ او زینو ۔ کچھ سوئیاں میٹھا ہو تو یہاں دے جا ۔ میری بی بی آئی ہے ۔"

شاید وہ اپنی پڑوسن کو آواز دے رہی تھیں ۔

ہائے یہ مجبور بڑھاپا ۔ اور یہ محبت ! میرا دل اندر سے رو اُٹھا، میں خود کو سنبھال کر بولی ۔" آپ تکلیف نہ کیجیے دادی بی ۔ مجھے

بالکل بھوک نہیں ہے ۔ بس آپ میٹھی باتیں کیجئے آپ سے ملے اتنے دن ہو گئے کہ جی چاہتا ہے۔ بس آپ سے باتیں کئے جاؤں۔"

"ہاں بی بی ۔" وہ دکھ سے بولیں ۔" اب تو بڑی ہو گئی تو عقلمند بھی ہو گئی ۔ کوئی میرے پکارنے پر پلٹا نہیں تو تو نے کہہ دیا کہ بھوک نہیں ۔ میں کیسے مان لوں کہ تجھے بھوک نہیں ۔"

ماحول اس درجہ دردناک ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے آنسو روکنا دوبھر ہو گیا تھا ۔ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی ۔ مانو جگ بیت گئے ہوں ۔ پھر میں خود کو سنبھال کر بولی ۔" دادی بی یہاں تو آپ کی دیکھ ریکھ کرنے والا بھی کوئی نہیں ۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر بمبئی چلئے نا ۔"

وہ کرب ناک انداز سے مسکرائیں ۔" بی بی جانے والی ہوتی تو پاکستان نہ چلی گئی ہوتی ۔ ایک ایک نے خوشامد کی مگر مجھے میری مٹی عزیز ہے ۔ اب تھوڑے دن رہ گئے ۔ کہاں جاتی پھروں گی ۔ بس خدا عزت سے اٹھا لے ۔ یہی دعا ہے ۔" پھر وہ کچھ یاد کر کے بولیں ۔" تیری نانی تو اچھی ہیں بی بی ۔"

"ہاں دادی بی ۔ وہ بھیا کے پاس رہتی ہیں ۔"

جس در و دیوار کے سائے تلے اور جس محبت بھری آغوش میں، میں ہمیشہ ایک سکون پایا کرتی تھی آج وہیں مجھے کانٹوں کی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی ۔ اک درد سا دل میں اٹھ رہا تھا ۔ جی چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر رو دوں مگر آنسو بھی جیسے مونہہ چھپا کر کہیں بیٹھ گئے تھے

"اچھا دادی بی اب میں چلوں ۔" بڑی دیر بعد بڑی ہمت باندھ

کر اتنا جملہ کہہ سکی۔

"اچھا۔ خدا تیرا نگہبان ہو بی بی۔ وہ ٹوٹی ٹوٹی آواز سے بولیں۔ اک دم انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ مگر ذرا ٹھہر۔ اپنی عیدی تو لیتی جا۔" اتنا کہہ کر انھوں نے ٹٹول ٹٹول کر اپنی بوسیدہ سی تھیلی کمر سے نکالی، اور اس کے اندر بہت دیر تک انگلیاں گھنگھولنے کے بعد ایک سکہ نکال کر مجھ سے تصدیق چاہی۔

"بی بی دیکھ تو ذرا یہ چونی ہی ہے نا۔"؟

میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ پھر انھوں نے اٹکل سے میرا ہاتھ تھاما اور میری تبد ہتھیلی کھول کر چونی اس میں رکھ کر پھر سے مٹھی بند کر دی، اور بڑے ہی رازدارانہ لہجہ میں پوچھنے لگیں۔" اچھا بی بی یہ تو بتا تو ان چار آنوں میں کیا خریدے گی۔؟

پہلی بار میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دادی بی کی آنکھیں چلی گئی ہیں ورنہ اگر دادی بی یہ دیکھ لیتیں کہ میرے جسم پر ہزار بارہ سو کی ساڑی ہے، بدن زیورات سے بوجھل ہے۔ سر پہ سونے کا کلس جگ مگ کر رہا ہے اور میں بڑی سی کوٹھی سے اُٹھ کر اتنی لمبی چوڑی کار میں بیٹھ کر ان سے ملنے آئی ہوں کہ سڑک کار سے یہاں سے وہاں تک بھر گئی ہے۔ تو تو۔ تو، تو۔

اب ضبط کی ہر حد ختم ہو گئی تھی، میں ننھے بچوں کی طرح کھلے دل سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔ محبت کا وہ عظیم عطیہ، وہ چونی جو لاکھوں خزانوں پر بھاری تھی۔ میری ہتھیلی پر لرز رہی تھی۔ میں نے اپنی مٹھی اپنے سینے سے لگا لی۔

"دادی بی — میں ان چار آنوں سے کچھ بھی نہیں خریدوں گی میں ان چار آنوں کو کبھی خرچ نہیں کروں گی — کیونکہ یہ تو وہ عظیم رقم ہے کہ چاہوں تو اس سے ساری دنیا خرید لوں، لیکن یہ کیسے گوارا کر پاؤں گی کہ اس دولت کو خود اپنے ہاتھوں سے کسی اور کو دیدوں یہ چوّنی کسی دکاندار کے ہاتھ میں نہیں جائے گی، دادی بی — یہ سدا میرے دل میں تعویذ بن کر رہے گی۔

میں نے یہ سب کہنا چاہا۔ لیکن آنسوؤں کی تیز بوچھار میں الفاظ ساتھ نہ دے سکے۔

سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں۔ یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں سجا رکھی ہے جو کبھی اس لاکٹ کو گلے سے الگ ہی نہیں کرتی — ؟

لیکن میں یہ سوچ کر جواب دیتے دیتے رہ جاتی ہوں کہ اگر میں نے بتا بھی دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے کیا سجا رکھا ہے تو سننے والے کیا واقعی یقین کریں گے۔ ؟۔

"جہالت کے خلاف جہاد"

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

جو اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کو محیط کئے ہوئے ہے

قسط وار

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوگا

عمدہ سفید کاغذ ۲۳×۳۶/۸ کے صفحات پر

فوٹو آفسیٹ متعدد تصاویر کے ساتھ

قیمت ۴ روپے

ایڈیٹر:- واجدہ تبسم

ملنے کا پتہ

ریلوے بلاک ۱۳۱ فلیٹ نمبر ۱۰

فون نمبر ۳ ۶ ۲ ۸ ۷ ۵

واجدہ تبسم کی کتابیں

۱۔	آیا بسنت سکھی	قیمت	۱۸ روپے
۲۔	اترن	"	۲۰ روپے
۳۔	نتھ کا بوجھ	"	۲۰ روپے
۴۔	کیسے کاٹوں رین اندھیری	"	۱۲ "
۵۔	پھول کھلنے دو	"	۱۲ "

زیر طبع

۶۔	شہر ممنوع	چوتھا ایڈیشن	۲۰ روپے
۷۔	زخم دل اور مہک	رومانٹک افسانے	۲۰ "
۸۔	نتھ اترائی	طوائفوں پر کہانیاں	۲۰ "
۹۔	نیند دروازے	بچوں کی کہانیاں	۱۰ "

ملنے کا پتہ

اورسیز بک سینٹر

C/5 ریلوے بلاک ۱۳۱، فلیٹ نمبر ۱۰

فون نمبر ۵۷۸۲۶۳

ادارہ اُورسیز بک سنٹر

آپ کا مشکور ہو گا۔ اگر آپ واجدہ تبسّم کی کوئی کتاب کسی ادارے سے چھپی ہوئی دیکھیں تو ہمیں مطلع کریں۔

واجدہ تبسّم کی تمام کتابیں چھاپنے کے پورے حقوق ادارہ اُورسیز بک سنٹر کے پاس محفوظ ہیں اگر کوئی بھی ادارہ بغیر اجازت واجدہ تبسّم کی کوئی کتاب چھاپتا ہے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی

منیجر

اورسیز بک سنٹر

طابع سراج الدولہ نے یونیورسل لیتھو پریس ۲۳ نورجی اسٹریٹ بمبئی ۲ سے چھپوا کر ناشر!۔ ٹیپو سلطان نے اورسیز بک سنٹر ۵م-۱ نامعلوم لنکن مد ڈ جو ہو ڈرے پاڑے اکیم بمبئی ۵ سے شائع کی

"جہالت کے خلاف جہاد"

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

جو اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کو محیط کئے ہوئے ہے

قسط وار

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوگا

عمدہ سفید کاغذ $\frac{23 \times 36}{8}$ کے ۴۸ صفحات

فوٹو آفسیٹ ۔ متعدد تصاویر کے ساتھ

قیمت ۴ روپے فی قسط

ایڈیٹر : واجدہ تبسم

Title Printed at Khatri Art P. Press Bombay-400 003.